ایک آنکھ والا ہرن

(افسانے)

اوم کرشن راحت

ایک آنکھ والا ہرن

اوم کرشن راحت

مصنّف ———— اوم کرشن راحت
پیدائش ———— ۲۶ر جنوری ۱۹۲۵ء
مقامِ پیدائش ———— لدھیانہ (پنجاب)
سکونت ———— فریدآباد (ہریانہ)
پتہ ———— ۵-ایل-۱۵۲ فریدآباد ٹاؤن شپ
سالِ اشاعت ———— دسمبر ۱۹۸۲ء
قیمت ———— پندرہ ۱۵ روپے
مطبوعہ ———— اعلیٰ پریس بلیماران، دہلی
کتابت ———— گوشۂ کتابت ۵۶۵ مٹیا محل دہلی
تعداد ———— ۷۵۰

ملنے کے پتے

۱- ادبی سنگم 152/L 5 فریدآباد ٹاؤن شپ
۲- سینٹر باؤری، چوک گھنٹہ گھر، لدھیانہ (پنجاب)

یہ کتاب ہریانہ ساہتیہ اکیڈمی چنڈی گڑھ کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے

اپنے محترم چچا جناب سروپ کرشن کے نام

جو پنجاب و ہریانہ کے اعلیٰ ترین عہدوں پر متمکن رہے

اور جن کی سادگی اور ایمانداری میرے لئے ابھی تک

مشعلِ راہ ہے۔

"بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

دو لفظ

ہریانہ ساہتیہ اکادمی ریاست کے ادیبوں کی ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے کام میں مصروف ہے۔ ہریانہ کے ادیبوں کو ہندی، پنجابی، اُردو یا سنسکرت میں ان کی غیر مطبوعہ تخلیقات کو شائع کروانے کیلئے مالی امداد بھی دی جاتی ہے۔ اِسی اسکیم کے تحت جناب اوم کرشن راحت کی اِس کتاب "ایک آنکھ والا ہرن" کو شائع کرنے کے لئے بھی مالی امداد دی گئی ہے۔ یہ جناب راحت صاحب کے بہترین افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اُمید ہے کہ اُردو ادب میں شغف رکھنے والے اِسے پسند کریں گے۔

کرشن مدھوک

(کرشن مدھوک)

ڈائریکٹر

ہریانہ ساہتیہ اکادمی

پھر اپنی بات

انسانی فطرت بھی عجیب نفسیاتی عمل ہے۔ صبح سے شام تک اپنی بات کہہ کر بھی تخلیق کار کی تشفی نہیں ہوتی۔ شعر ہو یا افسانہ ہوتی تو اپنی ہی بات ہے۔ پھر یہ اپنی بات کیا معنی؟ یہی نہ کہ یہ ایک روایتی فرض ہے جسے نباہتے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے کہانی سترہ سال کی عمر میں لکھنا شروع کی اور پہلا ہی افسانہ ہندی رسالے میں شائع ہوا تو بہت خوشی ہوئی تھی۔ اس کے بعد بھی کچھ کہانیاں چھپتی رہیں لیکن سب دو لڑکیوں ایک لڑکا یا ایک لڑکی اور دو لڑکوں کے فارمولے سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ ہر تخلیق کار کی ذاتی طبع موضوعِ ادب کی بھی خالق ہوتی ہے۔ میری فطرت میں صبر نام کی کوئی چیز نہیں اور اسی لئے غزل کو سینے سے لگائے رکھا کیونکہ اس میں بہت جلد ہیجانِ قلب یا بپھرے ہوئے جذبات کو سکون مِل جاتا ہے جبکہ کہانی کے لئے "صبرِ ایوب" کی ضرورت ہے۔

اب جو کہانیوں کا مسودہ لے کر بیٹھا تو محسوس ہوا کہ یہ کام کتنے جوکھم کا ہے۔ یہاں وہاں زبان و بیان کا جھول، الفاظ کی نشست و برخاست کہانیوں کی طوالت بہت کچھ اکھرنے لگا لیکن "نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" کے مصداق اور جناب ہیرانند سوز کے مشورات بلکہ تصیحات نے حوصلہ بڑھایا کہ اب جو کتاب چھپوانے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو یونہی سہی۔ اپنی کہانیاں سوز صاحب کو دیکھنے کے لئے دیں اور جب انھوں نے لوٹائیں تو ان کی سُرخ سیاہی سے ٹھیک کی ہوئیں غلطیاں میری نگارش سے کہیں زیادہ تھیں اور سچ تو یہ ہے کہ اب اس طوالت کا الزام ان پر دھرا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

میری کہانیاں اس قدر طویل کیوں ہو جاتی ہیں اس کا تجزیہ تو نہیں کر پایا ہوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھتے وقت جذبات قابو میں نہیں رہتے اور وہ آگ جو قلب و ذہن میں بھڑکتی ہے الفاظ کی ا... بجھتی نہیں ... ایک ... یہ ... میری کہانیوں کی سب

سے بڑی کمزوری بلکہ یہی ہے کہ میں لکھتے وقت ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو جاتا ہوں۔

دوسری کمزوری یہ ہے کہ لکھتے وقت میرے ذہن میں کہانی کی کوئی واضح شکل نہیں ہوتی۔ میں لکھنے کچھ بیٹھتا ہوں بات کہیں اور جا پہنچتی ہے۔ بعض اوقات اس کا نتیجہ خوبصورت بھی ہو جاتا ہے لیکن اکثر کہانی اُلجھ کر ایک معمہ سا بن جاتی ہے۔ میرے ذہن پر امریکہ کے کہانی کار او۔ ہینری کا بہت اثر ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر کہانی کو ایسا موڑ دینے کو بے تاب ہو جاتا ہوں جو قاری کو چونکا دے۔ میں اس کاوش کے باوجود او۔ ہینری کی گرد کو بھی نہیں چھو سکتا لیکن دامن فکر کو اس کے اثر کی گرفت سے چھڑا بھی نہیں سکتا۔

ہندوپاک کے کہانی کاروں میں پریم چند، عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی بہت پسند ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کی کہانیاں پڑھ کر تو جی چاہتا ہے کہ کہانیاں لکھنا بند کر دوں۔ اور کرشن چندر کا طنز؟ الٰہی توبہ! اے کاش میں ایک فقرہ بھی ان کے رنگ میں لکھ سکتا!

میں اپنی کہانیوں کو مختصر کہانی نہ کہتے ہوئے طویل مختصر کہوں تو غلط نہ ہوگا۔ اور پھر میری کہانیوں میں کہانی پن ہے کہ نہیں یہ بحث طلب مسئلہ ہے کیونکہ کہانی پر بڑے کڑے وقت گزرے ہیں۔ کبھی کہانی پن کو کہانی کی جان ٹھہرایا گیا کبھی کمزوری! اور اب کہانی پر کیا بیت رہی ہے کل اس پر کیا بیتے گی یہ کہانی جانے کہانی کار جانے یا تنقید نگار۔

اپنے بارے میں مختصراً یہ کہوں کہ اس کتاب کے چھپنے تک میں اس ذلت آمیز ملازمت سے سبکدوش ہو جاؤں گا جو پچھلے تیس برس سے جسم پر نہیں بلکہ روح پر بوجھ بنی رہی ہے اور اس دوران روح کہاں کہاں اور کن کن ہاتھوں سے گھائل ہوئی ہے یہ وہ لوگ جانیں جنہیں بے ایمانی اور رشوت خوری کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا، کچھ اچھا ہی نہیں لگتا۔

لدھیانہ اور بمبئی جیسے شہر چھوڑ کر فریدآباد میں آبسا ہوں لیکن ؎

"دل پہ تو یہ فضائے بیاباں بھی تنگ ہے!"

اور اب ذہنی کیفیت یہ ہے ؎ توڑ کر سلسلے محبت کے

کون جانے کدھر نکل جاؤں

ادم کرشن راحت

ایک آنکھ والا ہرن

بکرم نے جب ریاست کے سب سے بڑے پہلوان کو بیس ہزار لوگوں کے سامنے پچھاڑا تو سارا میدان تالیوں سے یوں گونج اُٹھا جیسے دُور دور تک فتح کے نقارے بج رہے ہوں۔ بیس اکیس سال کا وہ سجیلا نوجوان جس کا سینہ کسی پہاڑ کی طرح وسیع تھا ایک دیو کی طرح اکھاڑے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ اس کے سنہری بال ہوا سے اس کے ماتھے پر لہرا رہے تھے۔ اس کے بازو گول اور پٹھے سڈول اور ایسے جیسے وہ گوشت پوست کے نہ ہوں بلکہ فولاد کے بنے ہوں۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں وہ کسی یونانی دیوتا کے بُت کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ تالیوں کی گونج تھی کہ رکنے میں نہ آتی تھی۔ لوگوں کا ہجوم اکھاڑے کی طرف بڑھ رہا تھا اور ریاست کی گھوڑ سوار پولیس بھیڑ کو پیچھے دھکیل رہی تھی۔ لاوڈ سپیکر کی آواز تو آرہی تھی لیکن تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں سُنائی کچھ بھی نہ دے رہا تھا۔

ریاست کی سالانہ کھیلیں اور کشتیاں بڑی دھوم دھام سے منائی جاتیں۔ مہاراجہ صاحب اپنی دیگر مصروفیات چھوڑ کر بہ نفس نفیس تشریف لاتے اور کھیلوں کے شروع ہونے سے انعامات بانٹنے تک اپنی شاہی کرسی پر بیٹھے رہتے۔ سبھی رانیاں سبھی راجکمار اور راجکماریاں جو عموماً دوسرے ملکوں میں گھوما یا پڑھا کرتے اس سالانہ جشن میں شامل ہونے کے لئے ضرور پہنچ جاتے، اس کی ایک وجہ یہ بھی

تھی کہ مہاراج کا جنم دن بھی اسی روز ہوتا تھا۔ شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے سبھی لوگ یہاں موجود ہوتے اور دیگر ریاستوں سے بھی بہت سے مہمان تشریف لاتے۔ سب لوگ اپنی بیویوں لڑکیوں اور بہوؤں کو بنا سنوار کر لانے میں اپنا فخر سمجھتے کیونکہ یہی تو وہ حُسن کا اکھاڑا تھا جہاں عموماً عشق و محبت کی داغ بیل رکھی جاتی جہاں راجکماروں کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور یہیں تو دھڑکنوں کا شمار کیا جاتا اور ان پر امیدوں کے محل تعمیر کئے جاتے۔ جہاں چوری چھپے ایک دوسرے کے پتے دریافت کئے جاتے۔ جہاں سے کمسن شہزادیاں سُہانے سپنے سمیٹ کر اپنے گھر لے جاتیں جہاں حُسن کا ہجوم اکٹھا ہو کر اندر دیوتا کے پریوں کے اکھاڑے کو بھی مات کر دیتا جہاں خوشبوئیں اُڑا اُڑ کر سمندر کے جوار بھاٹا کی طرح فضا میں امنڈ پڑتیں جہاں سارا دن ولائتی شراب کے دَور چلتے جہاں کھانا کھانے کے لئے باہر نہیں جانا پڑتا بلکہ چاندنی میں ڈھلی ہوئی خوش لباس حسینائیں خود ہی جہان بھر کی نعمتیں چاندی کی طشتریوں میں لئے پیش کرتیں جیسے ان کے ساتھ ساتھ وہ بھی ایک سجا سجایا دسترخوان ہوں۔ شہزادوں کی بھوکی نگاہیں ان حسین داسیوں کے عارضوں سے پھسل کر ان کے ابھاروں پر اس وقت تک جمی رہتیں جب تک ان کا سحر کوئی اور اپسرا آ کر نہ توڑ دیتی اور اس وقت تو فضا سے نقرئی قہقہے گونج اٹھتے جب کوئی البیلا شہزادہ اپنی رانی ماں سے کہہ دیتا "ممی یہ کتنی حسین ہے۔ کر دو نا اس سے میری شادی۔" لیکن خواہش کے یہ لمحے نئی آنے والی تک ہی محدود رہتے اور وہ اپنی جاذبیت اور دلفریبی سے اس کی خواہش کو بھلا دیتی۔ ایسے ہی داسیاں بنتے ٹوٹتے محل چھوڑ کر اگلے شہزادوں کی طرف بڑھتی جاتیں اور وہ شہزادوں کے رخساروں کو دیکھنے لگتیں جو اُن کے اپنے عارضوں سے زیادہ گلابی چکنے اور ملائم ہوتے۔ غرضیکہ سارا دن حُسن کی

ندیاں بہتیں۔ سارا دن نظریں گورے گورے گالوں سے گدرائے گدرائے جسموں سے ٹکراتی رہتیں۔ سارا دن شراب رسیلے قہقہوں میں رس گھولتی رہتی۔ حُسن کا دریا بہتا رہتا جس میں دلوں کی ننھی ننھی کشتیاں ہچکولے کھاتی اور تیرتی رہتیں۔

پبلک کو اس حُسن کے دریا سے بہت دُور رکھا جاتا تاکہ لوگوں کی نظروں سے حُسن میلا نہ ہو پائے۔ اگر کوئی منچلا اپنی دوربین سے اس نظارے کا لطف لیتا تو دوسرے لوگ حسرت سے اسے یوں دیکھنے لگتے جیسے وہ بھگوان کے سورگ میں جھانک رہا ہو لیکن پولیس کے ڈر سے دوربین تھیلے میں چلی جاتی اور اس کے ساتھ ہی ایک آہ اس کے دل سے اٹھ کر ہونٹوں تک آتے آتے ختم ہو جاتی۔

بکرم ڈوبتے سورج کے اس پسِ منظر میں ایک جنّ کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ لوگوں کا شور کم نہیں ہو رہا تھا۔ بکرم کا باپ جو مہاراجہ صاحب کا خاص مالی تھا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ اس پنڈال کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں بڑے لوگ بیٹھے تھے اور عام لوگوں کی نظر وہاں تک نہیں پہنچ پاتی تھی۔

بکرم سوچ رہا تھا کہ ان دنوں وہ کتنا کمزور اور ڈرپوک تھا جب وہ باپ کی انگلی پکڑ کر مہاراجہ کے محل میں جایا کرتا تھا۔ اسے محل میں گھسنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ بس وہ سہما سہما برآمدے میں ہی سیڑھیوں کے پاس بیٹھا دیوار پر لگے شیر، چیتے، بارہ سنگھے اور ہرنوں کے سروں کو دیکھ کر ڈرا کرتا تھا۔ جب تک اس کا باپ محل میں کام کرتا رہتا۔ اس کا دل ان سروں کو ہی دیکھ کر دھڑکتا رہتا۔ اس کے دل میں نہ جانے یہ ڈر کیوں رہتا کہ ان جانوروں میں جان پڑ جائے گی اور پھر اس کی نظر پہرے دار کی بندوق پر اٹھ جاتی جو پہرے دار کی وردی پر لگے تمغوں سے بھی زیادہ چمکیلی تھی۔ کبھی کبھی اس کی نگاہ اس چڑیا پر جا پڑتی جو دیوار پر لگے ہرن کے سر پر بیٹھ کر اس کی چمکیلی آنکھ پر ٹھونگیں مارتی۔ پہرے دار اسے اڑاتا

بھی تو وہ گھوم پھر کر پھر وہیں آ بیٹھتی اسے یاد تھا کہ ایک دن ہرن کی چمکیلی آنکھ ہرن کے چہرے سے زمین پر گر پڑی اور چڑیا چوں کر کے وہاں سے اڑ گئی تھی۔ پہرہ دار کو آنکھ کے گر جانے کا پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ وہ آنکھ بالکل بکرم کے پاس گری تھی۔ وہ کبھی ہرن کے سر کو کبھی گری ہوئی آنکھ کو دیکھتا۔ ہرن کا چہرہ آنکھ گر جانے سے کتنا بھیانک ہو گیا تھا۔ اب آنکھ کی جگہ ایک گہرا گڑھا تھا اور آنکھ اس کے پاس ہی پڑی تھی۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے اس آنکھ کو چھو کر دیکھا تھا اور پھر پہرے دار کی نظر بچا کر اسے اپنی قمیض کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ اس چوری کے بعد وہ بے تابی سے اپنے باپ کا انتظار کرنے لگا تھا۔ آج اس نے محل میں بہت دیر لگا دی تھی۔ چڑیا بھی تو لوٹ کر نہیں آئی شاید وہ بہت ڈر گئی تھی۔ جب اس کا باپ باہر آیا تو اس کی جان میں جان آئی تھی۔ راستہ بھر اس کا ہاتھ جیب سے دور نہیں ہوا تھا اور گھر جا کر اس نے ہرن کی آنکھ احتیاط سے ایک مٹی کے برتن میں رکھ دی تھی۔

اسے یہ بھی یاد تھا کہ تھوڑے ہی دنوں بعد جب وہ پھر برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھا اپنے باپ کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک مہاراجہ صاحب محل سے نکل کر برآمدے میں آ گئے تھے۔ ان کے چہرے پر رعب تھا، کتنا شاندار لباس تھا ان کا۔ وہ یہ سب دیکھ ہی رہا کہ ایک سپاہی اسے اٹھا کر دور لے گیا تھا لیکن اتنی دوری سے ہی اسے پتہ لگ گیا تھا کہ مہاراجہ صاحب بہت غصے میں ہیں وہ پہرے دار کی بندوق چھین کر اسی کے کندے سے اسے پیٹ رہے تھے۔ شاید انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ہرن کی ایک آنکھ اس کے چہرے سے غائب ہے۔ اس کا اپنا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ پہرے دار کو پٹتا دیکھ کر اس کا جی چاہا تھا کہ وہ بھاگا بھاگا

گھر جائے اور وہاں سے ہرن کی آنکھ لاکر مہاراجہ صاحب کے ہاتھ پر رکھ دے اور پھر سے دارکو مارسے بچالے۔

اس نے دیکھا کہ اس کا باپ بھی وہیں برآمدے میں ایک طرف سر جھکائے کھڑا تھا اور بھی کئی نوکر بھاگتے ہوئے وہاں آگئے تھے۔ ایک نوکر جلدی سے سیڑھی اٹھا لایا تھا۔ فوراً ہی ایک آنکھ والے ہرن کا سر اتار کر وہاں ایک دوسرے ہرن کا سر لگا دیا۔ اور نوکروں نے ایک آنکھ والے ہرن کا سر اس کے باپ کو تھما دیا تھا۔

مہاراجہ صاحب آٹھ گھوڑوں والی بگھی میں بیٹھ کر جا چکے تھے۔ بہرہ دار لہولہان پڑا تھا۔ سہمے ہوئے نوکر پھر اپنے کام میں جٹ گئے تھے اور اس کا باپ ایک آنکھ والے ہرن کا سر اٹھائے اس کے ساتھ گھر کی طرف چل دیا تھا۔

مہاراجہ صاحب کے محل سے تقریباً ایک کوس دور آڑوؤں کے گھنے پیڑوں میں مالی کا جھونپڑا تھا۔ وہاں پہنچتے پہنچتے اس کا باپ ہانپ گیا تھا۔ ہرن کا سر گھر میں رکھ کر وہ پھر مہاراجہ صاحب کے باغ میں کام کرنے چلا گیا تھا۔ باپ کے چلے جانے کے بعد پہلے تو وہ ہرن کے سر کو دیکھ دیکھ کر ڈرتا رہا پھر اس کے پاس جاکر اس نے آنکھ والے سوراخ میں جھانکا۔ اس کے سینگوں کو چھوا۔ نتھنوں میں انگلی ڈالی تھی۔ اس نے چرائی ہوئی آنکھ کو برتن سے نکال کر سوراخ میں پھنسانے کی کوشش بھی کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوا تھا اور وہ آنکھ پھر اس نے اپنی بلوری گولیوں میں رکھ دی تھی۔

اس سوچ میں بکرم کو پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کب اکھاڑے سے پنڈال تک آپہنچا تھا۔ وہاں سب انعام جیتنے والے بیٹھے تھے۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ

سے جب اس کا خیر مقدم کیا گیا تو وہ اپنے خیالوں سے چونکا۔ پنڈال اور مہاراجہ صاحب کی کرسی کے درمیان اب بھی کافی فاصلہ تھا۔ مہاراجہ صاحب یہاں سے دکھائی تو دیتے تھے لیکن دھندلے دھندلے سے۔ مہاراجہ صاحب کے عقب میں حُسن کا دریا اب بھی موجزن تھا۔ خوشبوئیں اب بھی فضا کو معطر کئے ہوئے تھیں۔ بکرم اپنے باپ کے ساتھ ایک طرف بیٹھ گیا۔ وہ مہاراجہ صاحب کے پیچھے بیٹھی مخلوق کو دیکھنے لگا جو شاید اس دنیا سے تعلق نہیں رکھتی تھی۔ شاید وہ سورج کی کرنوں کے ساتھ ساتھ اس دھرتی پر اُتر آئی تھی۔ اس کی نگاہیں ان خوبصورت چہروں پر جم کر رہ گئیں۔ وہ وہاں کا سارا حُسن اپنے اندر سمیٹ لینا چاہتا تھا۔

وہ حُسن کے اس نظارے میں گم تھا جب ایک عہدے دار نے اسے وردی پہننے کو دی۔ اسے اچانک اپنے ننگے جسم کا احساس ہوا۔ اس کا جسم ڈوبتے سورج کی سنہری کرنوں میں کانسے کی طرح چمک رہا تھا اور کہیں کہیں جسم پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ حالانکہ اسے اپنے مقابل کے پہلوان کو چت کرنے میں اکھاڑے کی مٹی سے زیادہ جھوجھنا نہیں پڑا تھا۔

وہ مسکراتا ہوا کپڑے بدلنے کے لئے اس عہدے دار کے ساتھ دوسرے خیمے میں چلا گیا اور کپڑے بدلنے کے بعد اس نے اپنی شکل آئینے میں دیکھی تو وہ حیران رہ گیا۔ وہ تو واقعی ـــــ اسے اب اس مہارانی کی بات یاد آئی جس کی کوٹھی پر وہ پچھلے ہفتے پھول دینے گیا تھا۔ مہارانی صاحبہ جب اسے برآمدے میں ساتھ لے گئی تھیں تو شاید گھر میں کوئی نہیں تھا لیکن اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر جھروکے کی آنکھیں ہیں اور ہر دیوار کے کان اور داسیوں کی دبی دبی ہنسی بھی جیسے برآمدے کے ہر ستون کے پیچھے سے سُنائی دے رہی تھی۔ مہارانی صاحبہ نے جب اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا تھا تو اس کا دم ہی نکل گیا

تھا۔ کرسی اور وہ بھی مہارانی صاحبہ کی۔ اس نے تو کبھی ایسی کرسی کو چھو کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ چپ سا کھڑا رہا اور جب مہارانی صاحبہ نے قریب آ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا تو اسے محسوس ہوا جیسے وہ خوب صورتی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب رہا ہے۔ اسے بٹھا کر مہارانی صاحبہ اندر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد مہارانی صاحبہ کی آواز سنائی دی " لو چلو دیکھ لو غور سے۔ ایک ایک نقش تمہارا ہے۔ تمہاری ناک، تمہارے ہونٹ، تمہاری ٹھوڑی، تمہارا ماتھا اور چوڑی چھاتی تو بالکل ـــــ دوسری آواز نے شی کہہ کر مہارانی صاحبہ کو چپ کرا دیا تھا۔

مہارانی صاحبہ کسی کو باہر لانے کی کوشش کر رہی تھیں اور وہ عورت باہر آنے پر شاید رضامند نہیں ہو رہی تھی۔ وہ حیران و پریشان وہاں بیٹھا رہا۔

" اگر مہاراجہ صاحب کو پتہ چل گیا تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے" اندر سے آواز آئی، لیکن میری ممتا مجھے جینے نہیں دیتی موسی۔ میرا جی چاہتا ہے میں اس سے لپٹ جاؤں۔ اس کا منہ چوم لوں۔ اسے اتنا پیار کروں اتنا پیار کروں کہ میرا دم نکل جائے اور پھر چاہے میں اپنی ممتا سمیت بھسم ہو جاؤں اور پھر ـــــ اچانک ایک عورت کمرے سے باہر نکل آئی تھی اور اس سے لپٹ گئی تھی۔ اس کے آنسو بکرم کے سینے میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ حیران تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا اور آنے والی عورت والہانہ طور پر اس سے لپٹے جا رہی تھی۔ روئے جا رہی تھی اور بے تحاشہ اسے چومے جا رہی تھی۔ وہ اس کے اتنا قریب تھی کہ اس کے خدوخال بھی وہ نہ دیکھ سکا تھا۔ وہ اسے اب بھی آنسوؤں سے نہلائے جا رہی تھی اس کی پیٹھ پر اس عورت کی نرم و نازک انگلیاں گڑے جا رہی تھیں۔

وہ حیران تھا کہ یہ عورت کون ہے اسے اتنا پیار کیوں کر رہی ہے اور پھر

وہ عورت اس سے جدا ہو کر روتی بسورتی ایک دم اندر کمرے میں بھاگ گئی تھی۔ وہ اسے دیکھ بھی نہ سکا پہچان بھی نہ سکا اور کچھ سمجھ بھی نہ سکا۔

مہارانی صاحبہ اس کے قریب آئیں تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مہارانی صاحبہ روہانسی سی تھیں اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کہہ رہی تھیں "یہ تیری ماں تھی بکرم۔ مہاراجہ صاحب اور بڑی مہارانی صاحبہ کی بڑی شہزادی — " تجھے جنم دینے کے بعد مہاراجہ صاحب نے اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف، آنند نگری کے راجکمار سے کر دی تھی۔ اور تجھے۔ تجھے مالی کے ہاں پرورش کے لئے بھیج دیا تھا — تیری ماں تجھے دیکھنے کو ترس گئی تھی۔ مہارانی کہتی رہیں اور وہ سنتا رہا۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد وہ مہارانی صاحبہ کی کوٹھی سے اپنے گھر تک پتھر کے بت کی طرح سوچ سے عاری چلا جا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں بہت سے خیالات گڈمڈ ہو گئے تھے۔ گھر پہنچ کر وہ چارپائی پر گر گیا تھا۔ بہت دیر بعد اس کے من کی حالت سنبھلی، وہ پھر سے سارے واقعہ پر غور کرنے لگا۔ اسے اب یاد آ رہا تھا کہ جب کبھی اس نے اپنے باپ سے ماں کے بارے میں پوچھا تھا تو اس کا باپ یہی کہہ کر ٹالتا رہا تھا کہ بیٹا جب تو پیدا ہوا تھا تو وہ مر گئی تھی۔ لیکن آج کے واقعہ نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ کون تھی — وہ اگر اس کی ماں تھی — تو اس کا باپ کون تھا — ایک شہزادی بوڑھے مالی کی بیوی تو ہو نہیں سکتی — اس کا ماتھا جل رہا تھا۔ اس کا بدن پھنک رہا تھا۔ جہاں جہاں اس عورت کے آنسو گرے تھے وہاں وہاں جیسے کسی نے انگارے رکھ دیئے تھے۔ اس کے گالوں پر جہاں اس عورت نے پیار کیا تھا اسے لوہے کی جلتی سلاخیں گڑی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کے دماغ میں اس عورت کا مبہم سا بھی نقشہ نہیں تھا۔ بھینی بھینی ممتا کی مہک تھی

پیار کی خوشبو تھی اور بس۔

شام کو جب اس کا مالی باپ گھر آیا تو اس نے اپنے اندرونی کرب کی وجہ سے اپنے مصنوعی باپ کے اندر سے اس اسرار کو کریدنے کی پوری کوشش کی تھی۔ بوڑھا مالی بھی تاڑ گیا تھا کہ وہ بہت حد تک اس تلخ حقیقت کا بھید پا چکا ہے اس نے آخرکار کوئی اور ہنگامہ کھڑا ہو جانے کے خوف سے اسے اس راز کو راز رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے حقائق سے آگاہ کر دیا تھا۔ مگر اس محل کا ملازم اُسے یہ نہ بتا سکا تھا کہ رانیوں میں اس کی ماں کون ہے۔ اس کا باپ کون ہے۔ وہ غریب یہ بات خود بھی نہیں جانتا تھا۔ جشن کے دن سب ہنگاموں سے بے نیاز بکرم جب اس ادھیڑبن میں گم تھا تو چوبدار نے اس کا نام پکارا۔ وہ چونکا۔ اسے انعام کے لئے پکارا جا رہا تھا۔ ریاست کا سب سے بڑا انعام۔

سورج تقریباً ڈوب چکا تھا۔ افق پر سنہرے اور گلابی بادل ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ مہاراجہ صاحب کی کرسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی لالی اس کے چہرے پر کچھ اس طرح بکھر گئی تھی جیسے وہ ابھی ابھی ہولی کے رنگوں میں نہا کر آیا ہو۔ فضا تالیوں سے گونج رہی تھی۔ مہاراجہ صاحب کے پیچھے بیٹھی شہزادیوں اور مہارانیوں کے دل اسے دیکھ کر دھڑکنے لگے۔ شہزادے اپنے بوٹوں کی نوکوں سے زمین کھودنے لگے اور بکرم کے چوڑے چکلے سینے کو دیکھ کر وہ اپنے آپ شرمندہ ہو رہے تھے۔ کنواری شہزادیوں کے ذہن میں کئی سنہری خواب تیرنے لگے تھے

بکرم کی متلاشی نگاہیں ہر عورت پر تھوڑی دیر رکتیں اور پھر دوسرے چہرے پر گڑ جاتیں۔ ہر حسین چہرہ اسے اپنی ماں کا چہرہ لگتا تھا لیکن وہ اپنی ماں کو پہچان کیسے

پائے گا۔ یہ سوچ کر اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

اب وہ مہاراجہ صاحب سے پانچ چھ گز کے فاصلے پر تھا کہ ایک سنہری تار نے اسے آگے بڑھنے سے روک لیا۔ یہی ایک حد فاصل تھی جہاں سے وہ آگے قدم نہیں بڑھا سکتا تھا۔

دو تین خادموں نے مل کر بہت بڑا ایک چاندی کا کپ اٹھایا۔ اشرفیوں سے بھری چاندی کی تھالی اور بہت سے قیمتی خلعت جب اسے پیش کئے گئے تو آسمان تالیوں کی گونج سے پھٹا جا رہا تھا۔

مہاراجہ صاحب کا سیکریٹری کہہ رہا تھا "مہاراجہ صاحب نے فرمایا ہے کہ ان کو تم پر فخر ہے اور وہ اپنی فوج میں تمہیں کوئی بہت بڑا عہدہ دیں گے۔ یہ کپ یہ اشرفیاں اور یہ خلعت تمہارا انعام ہے۔ تم ریاست کے سب سے توانا اور خوبصورت جوان قرار دیئے گئے ہو۔" تالیاں پھر بج اٹھیں۔

دور پنڈال سے دور بھیڑ تتر بتر ہو رہی تھی۔ دھول کی وجہ سے سورج کی لالی سنولانے لگی تھی۔ بکرم نے یہ سب کچھ ہاتھوں میں تھام لیا۔ لیکن وہ ادب سے جھکا نہیں۔ اس نے شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔ اس کے ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا اور اس کا باپ دور ہی سے اسے چپ رہنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

مہاراجہ صاحب نے سیکریٹری سے کچھ کہا۔

"کیا تم کچھ اور انعام چاہتے ہو۔۔۔ بولو تمہیں کیا چاہیئے۔ مہاراجہ صاحب نے فرمایا ہے کہ جو مانگو گے۔۔۔ تمہیں ملے گا۔۔۔ کہو۔۔۔ مانگو کیا مانگتے ہو،"

بکرم کے چہرے پر جیسے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے سارے انعامات فرش پر رکھ دیئے اور جھک کر مہاراجہ صاحب کو سلام کیا۔۔۔ ہر طرف ایک سنّاٹا تھا۔

لوگ چپ ہو گئے تھے۔ جیسے بکرم مہاراج سے راج سنگھاسن مانگنے جا رہا ہو۔

اس نے ہکلاتے ہوئے کہا " مہاراج ۔ مہاراج مجھے اپنی ماں چاہیئے۔ وہ ان ہی میں کہیں چھپی ہے " اس نے مہارانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ " وہ مجھے مل نہیں رہی ہے "

مہاراج کا چہرہ غصّہ سے لال بھبھوکا ہو گیا۔ مہارانیوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ شہزادوں اور بڑے بڑے عہدے داروں کی تلواریں میانوں سے باہر آ گئی تھیں۔ ہر طرف سنّاٹا تھا۔ خوف تھا

سورج اب ڈوب چکا تھا۔ لوگ جا چکے تھے ۔ آسمان میں کہیں بھی لالی نہ تھی۔ نیچے زمین کا کچھ حصّہ سرخ تھا۔ ایک سڈول و توانا جسم تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس ویرانے میں جہاں کچھ دیر پہلے زندگی امنگوں کی طرح مچلی پڑ رہی تھی ۔ ایک سایہ لاش پر جھکا ۔ اس لاش کو چوم رہا تھا ۔ اِس چومنے میں ایک کرب تھا ۔ ایک دکھ تھا جیسے ممتا سزا بھوگ رہی ہو۔

آج کا بدھسٹ

"اس کے منہ کو پیچ لگ گیا ہے۔ سالا کمیونسٹوں کی سی باتیں کرتا ہے۔"
وہ اپنے دوست کے اٹھ کر چلے جانے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔ میری اس کی کوئی جان پہچان نہیں تھی۔ وہ دوسری میز پر بیٹھا اٹھ کر جانے والے کے ساتھ وہسکی پی رہا تھا اور میں اپنی میز پر بیٹھا بئیر ——— میں کتنی دیر سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا لیکن نہ تو ان کی باتیں سننے کی کوشش میں نے کی اور نہ ہی ان کی کوئی بات سمجھ میں آ رہی تھی — وہ دونوں کبھی غصے سے بولنے لگ جاتے تھے کبھی پیار سے باتیں کرنے لگ جاتے۔ اس نے جب اونچے سے مجھے مخاطب کر کے اوپر والا فقرہ کہا تو اس کے فقرے کے تیکھے پن اور فقرے کی ساخت نے مجھے چونکا ہی نہیں دیا بلکہ میں اپنا گلاس اور بیئر کی بوتل اٹھا کر اس کی میز والی خالی کرسی پر جا بیٹھا۔

اس نے لال لال چوندھی چوندھی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا "سالا مرے گا۔ پھانسی لگ جائے گا۔ سولی چڑھے گا۔ اب یہ زیادہ دن نہیں جئے گا۔ میں نے کچھ پوچھنا چاہا تو اس نے ایک ہاتھ سے اپنا گلاس اٹھا کر منہ کو لگایا اور دوسرا ہاتھ مہاتما بدھ کی طرح سے اٹھا کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے سارا گلاس پی گیا۔

" لو صاحب یہ وہسکی اب وہسکی ہی نہ رہی۔ بوتل پی جاؤ۔ ایک آدھ گھنٹے کے بعد پھر بیوقوف سا بن جاؤ۔ ہمارے وقت میں ایک تھی سالی راحت جان۔ لیکن صاحب کیا بات تھی اس کی ادا کی۔ کپورتھلہ سٹیٹ کی تھی۔ واہ صاحب صبح اٹھو پھر بھی نشہ۔ سالی راحت جان نہ ہوئی آفت جان ہو گئی۔ جالندھر سے جایا کرتے تھے راحت جان کو لانے کے لئے۔ چار روپے کی بوتل تھی۔ نہ صاحب نہ پوچھو راحت جان کے بارے میں نہ ہی پوچھو"

یہ سالے کانگریسی سونگھتے پھرا کرتے تھے ان دنوں۔ ٹوڈی بچہ کہا کرتے تھے ہم سرکاری نوکروں کو۔ اور دفتر میں آکر ایک ایک کام کے لئے اُلجھا کرتے تھے ہم سے اور ایک آدھ بوتل کا خرچہ مانگنے پر سو سو گالیاں سُناتے تھے اور کہا کرتے تھے "ہماری حکومت آنے دو سب ہیکڑی نکل جائے گی" صاحب ہیکڑی تو کیا نکلتی ہماری۔ ہم اور بڑے افسر بن گئے ایکسائز ڈیپارٹمنٹ میں۔ یہ سالے اب بھی کام کروانے آتے ہیں اور انگریزی شراب کی بوتل۔ چھوڑو۔ صاحب۔ چھوڑو۔

ہاں صاحب آپ ہی بتاؤ یہ سالے امریکن چاند پر پہنچ کر کیا کریں گے۔ اس نے بوتل کو گلاس میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ سُنا ہے چاند پر بیٹھ کر تانک جھانک کریں گے۔ ہندوستان میں چھتوں پر سونے والے میاں بیوی کی حرکتوں پر۔ اس نے میری طرف دیکھا اور جب میں نے کچھ بولنا چاہا تو اس نے پھر مہاتما بدھ کی طرح اپنا ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔ "تھوڑی وہسکی آپ بھی لے لو" اُس نے اپنی بوتل میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس بیئر سے کیا بنے گا تمہارا۔ ہمارے وقتوں میں چھ آنے کی آتی تھی چابی مارکہ Becks بیئر جرمنی کی بنی ہوئی۔ کیا سواد تھا اس کا۔ کیا سرور تھا اس کا۔ اب تو صاحب یہ لوگ (کاؤنٹر کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے) پانی میں کوئی گولی سی ملا کر دے دیتے ہیں — میں تو اب کبھی بیئر پیتا نہیں۔ سُنا ہے اب دس روپے کی آنے لگی ہے — دس روپے ان کی ہتھیلی پر رکھو۔ بیئر پیو۔ سامنے گلی میں جا کر دیوار سے لگ کر پیشاب کرو۔ دس روپے پھُر۔

صاحب ہم نے سُنا ہے دہلی سے بمبئی تک کا جہاز کا کرایہ اب ایک ہزار روپے ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ کئی کئی ہفتے سیٹ ہی نہیں ملتی۔ ملک ترقی کر رہا ہے۔ پیسہ برس رہا ہے ملک میں جیسے منی جان کے کوٹھے پر بھلے دنوں میں برسا کرتا تھا — صاحب منی جان بھی کیا تھی۔ ایک بار ایک انگریز ڈپٹی کمشنر نے مجھ سے کہا تھا کہ منی جان کا مجرا ہماری کوٹھی پر ہونا چاہیئے۔ لو صاحب بہت لالچ دیا۔ بہت منت سماجت کی ہم نے — منی جان کو نہیں ماننا تھا نہیں مانی۔ اور وہ انگریز ڈپٹی کمشنر بدلی کروا دیا گیا شہر سے۔ کاش منی جان اب ہوتی آج دیکھتے سالی کی اکڑ۔

مجھے محسوس ہوا کہ منی جان کا نام لیتے ہی اُس کی لال لال آنکھوں میں چمک سی آ گئی تھی۔ ہونٹ بھیگ سے گئے تھے اور وہ کچھ دیر چپ رہا تھا۔ اُس نے ٹھنڈی سانس لی اور غٹ سے گلاس خالی کر دیا۔

" آپ نے تاج محل دیکھا ہے ؟ اور ساحر کی نظم تاج بھی پڑھی ہوگی۔ کبھی ہم نے ساحر کے ساتھ تاج محل کے سامنے بیٹھ کر شراب پینے کے بعد ساحر کے منہ سے وہ نظم سُنی تھی — سالا اچھا لکھتا ہے لیکن شراب کے نشے میں کچھ مصرعے غلط پڑھ رہا تھا۔ میں نے "تلخیاں" بھی پڑھی ہے کچھ فرق لگتا ہے اس نظم کے کئی مصرعوں میں — آپ کی کیا رائے ہے

میں نے کچھ بولنا چاہا لیکن اُس نے مہاتما بدھ کی طرح پھر ہاتھ اُٹھا کر مجھے چپ کرا دیا۔ "بیرا — صاحب کے لئے ایک بیئر ٹھنڈی" — اُس نے بغیر ادھر ادھر

دیکھے شیر کی طرح دہاڑتے ہوئے کہا۔ میرے منع کرنے پر اُس نے اپنا ہاتھ ــــ

" تم اجنبی ہو شاید ــ بھئی یہاں ہزار بارہ سو روپے روز کی آمدن ہے۔ ایک بیئر آپ پی لوگے تو کیا ہو جائے گا۔ ہاں اگر رشوت کے پیسے کی جیں پیتے تو اور بات ہے ــــ ہاں تو وہ سالا ــ اپنا دوست جو ابھی میرے ساتھ بیٹھا پی رہا تھا۔ میرے مال کی نہیں پیتا۔ کہتا ہے میں حرام کی کمائی کی نہیں پیتا ــــ لو پوچھو اس سے حرام کی کمائی کی پینے سے نشہ نہیں ہوتا کہ نشہ زیادہ ہو جاتا ہے۔ چیز تو چیز ہی رہتی ہے چاہے حرام کی کمائی کی ہو کہ حلال کی ــ اتنی کوٹھیاں بنی ہیں رشوت کے پیسوں سے ــ کیا سب کی چھتیں گر گئی ہیں؟ ــ مرے گا سالا۔ پھانسی لٹکے گا ــ سولی چڑھے گا۔

کیوں صاحب کون سا سچ بولنے والا بچا ہے دنیا کے ہاتھوں سے۔ عیسیٰ مسیح ــ سقراط ــ منصور ــ مہاتما گاندھی ــ دنیا کے لوگ سچ برداشت ہی نہیں کر سکتے ــ لوگ تو یہ چاہتے ہیں کہ ان کی طرح جھوٹ بولو ــ مکر فریب کرو ــ پھر دیکھو تمہاری ملیں کھڑی کر دادیں گے۔ تمہیں عزت دیں گے ــ شامیں سہانی ہو جائیں گی ــ راتیں رنگین ــــ

" اور ضمیر مُردہ " میں نے کہہ ہی دیا

" سالا تو بھی گاندی نکلا ــ نیا آیا ہے شاید اس صنعتی شہر میں۔ کیونکہ میں نے تجھے کبھی اس سے پہلے نہیں دیکھا۔ میں کتنے ہی نشے میں ہوں جس کو ایک بار دیکھ لیتا ہوں بھولتا نہیں ــ جس کو پہچان جاتا ہوں تو صحیح طور سے پہچان جاتا ہوں ــ ہاں تو سالا تو بھی پاگل سا لگتا ہے۔ ضمیر کی بات کرتا ہے اس یُگ میں ــ کہاں سے آیا ہے ــ کیا کام کرتا ہے ــ بول ــ اب میں بہت بکواس کر چکا اب تو کہہ ــ "

شاید اسے نشہ ہو گیا تھا یا شاید وہ غصے میں آ گیا تھا — وہ "صاحب" سے "آپ" آپ سے تُو کہنے پر اتر آیا تھا۔

"میں میں —"

"ٹھہر" اس نے پھر ہاتھ اوپر اُٹھایا — "کیا بجا ہے"

"ساڑھے آٹھ" میں نے کہا۔

اس نے چوندھی چوندھی آنکھوں سے اپنی گھڑی دیکھی — بالکل ٹھیک وقت ہے — مگر سالا تیری گھڑی — میری گھڑی سے کیسے مل گئی — تو کرتا ہے ضمیر کی باتیں اور ہم — چھوڑ دیار — ہاں وہ مرے گا — سولی چڑھے گا — سالا سچ بولتا ہے — ۔

"نوکری تلاش کرنے آئے ہو گے تم یہاں — اس نے بوتل میں بچی ہوئی ساری کی ساری گلاس میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ اگر تم اکاؤنٹس کے معاملات سمجھتے ہو تو نوکری مل جائے گی — اور اگر اکاؤنٹس میں کہیں ضمیر کی ہیرا پھیری کر دی — تو میاں چھٹی — کہو میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں

"میرے پاس سفارشی خط ہے — گلزار اینڈ سٹریز کے مالک کے نام —"

گل آزار اینڈ سٹریز — اس نے لفظ کو بگاڑ کر کہا — اور پھر اس نے اتنے زور سے قہقہہ لگایا کہ سبھی لوگ جو وہاں بیٹھے تھے اسے دیکھنے لگے — وہ سالا اس کمپنی کے مالک کا رشتہ دار ہے۔ وہیں نوکری کرتا تھا۔ غلط اکاؤنٹس بنانے سے انکار کیا تو نکال دیا نوکری سے اسے۔ اب لیبر کورٹ میں مقدمہ لڑ رہا ہے — ہو جائے گا دس پندرہ سال میں کوئی فیصلہ! — سالا مرے گا — سولی چڑھے گا — سچ بولتا ہے وہ۔

تم نے جنبش رشی کا نام سنا ہے — یار جب خوبصورت خوبصورت لڑکیاں اپنے کپڑے اُتار دیتی ہوں — تو خدا کی قسم اسے بھگوان ماننا ہی پڑتا ہے۔ کبھی ہم تو بہت

جلد پیدا ہو گئے یہی کوئی تیس پینتیس سال بعد پیدا ہوتے ـــ آج گھر والی کہہ رہی تھی بینگن چھ روپے کلو بکنے لگے ہیں۔ سالی سارا مزا کرکرا کر دیتی ہے۔ کوئی اس سے پوچھے کہ بینگن کوئی ہزار بارہ سو روپے کلو تو ہوئے نہیں ـــ سالی پھر فکر کس بات کی ہے ـــ وہ میز پر سر رکھ کے گانے لگا "اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے"

ایک بات ہے یہ تم سفارشی چٹھی لئے کب سے گھوم رہے ہو ـــ کل تو مالک تم سے ملے گا نہیں، آج بھی نہیں ملا ہو گا ـــ اس کی لڑکی کی شادی ہے۔ سنا ہے بہت ٹھاٹھ سے کر رہا ہے شادی۔ روپے بھی بہت کمائے ہیں سالے نے ـــ ویسے وہ نرنکاری ہے تو بھی نرنکاری ہو جاؤ ـــ رادھا سوامی ہو جاؤ۔ بالمکئے ہو جاؤ۔ شرابی ہو جاؤ۔ سوسلشٹ ہو جاؤ ـــ بھئی کچھ بھی ہو جاؤ لیکن ایک بات یاد رکھو کہ پڑھے لکھے نہ ہونا ـــ پھانسی لگ جاؤ گے

وہ رونے لگا ـــ سالا مر ے گا ـــ جوں جوں وہ سچ بولتا ہے میرا دل کانپ کانپ اٹھتا ہے، لگتا ہے اب وہ زیادہ دن نہیں جئے گا۔ اس کے دن بہت قریب ہیں۔ ہے سالا اپنا یار اگر وہ مر گیا تو اپنا جینا مشکل ہو جائے گا۔ اتنی سچی بات اور اتنے بھروسے سے کہتے ہوئے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ جب میں بہت پی کر بہک جاتا ہوں۔ سالا مجھے گھر تک چھوڑنے جاتا ہے۔ میری بیوی کے سامنے مجھے وہ خوبصورت گالیاں دیتا ہے کہ وہ شرما جاتی ہے۔ مگر یار اب پینے کے بعد گھر جانا پڑتا ہے ـــ وہ بھی دن تھے ـــ ہاتھ میں چنبیلی کا ہار منہ میں پان۔ راحت جان کا نشہ مئی بائی کا کوٹھا اور سالے بندیے دو کانوں سے اٹھ اٹھ کر ترستی آنکھوں سے دیکھا کرتے تھے ہمیں ـــ ویسے سرکار نے یہ سلسلہ بند کر کے کچھ اچھا نہیں کیا۔ بھئی ویسے تو ہم سرکار کے نوکر ٹھہرے۔ سرکار کا گن گان ہمارا فرض ہے۔ وہ جو کام کرتی ہے اپنی بھلائی کے لئے کرتی ہے ـــ اب یہی لوگ سرکار کو سب

پتہ ہے کہ ہم ہزار بارہ سو روز کے مار ہی لیتے ہیں اور سرکار کو یہ بھی پتہ ہے کہ بینگن اب چھ روپے کلو ملتے ہیں لیکن ہمیں تو سرکار کچھ نہیں کہتی اور یہ بھی نہیں پوچھتی کہ یہ سالے بینگن کیا دسا ور سے آتے ہیں — مگر جہاں سرکار کی غلطی ہو کہنا ہی پڑتا ہے۔ اچھے دنوں میں ہر شہر میں کوٹھے تھے — جاؤ گانا سنو — لوٹ آؤ —" اس نے میرے کان کے پاس منہ لا کر کہا — اب بھی ہر گلی کوچے میں یہ دھندا ہوتا ہے۔ سارے عیش سمٹ کر یا تو بیوپاری طبقے کی گود میں جا گرے ہیں یا سیاسی — چھوڑ یار۔ کبھی کبھی ہم سرکاری افسر بھی مزا لے ہی لیتے ہیں — پرسوں ہی کی بات ہے — یار سُنا ہے ڈانگے نے کمیونسٹ پارٹی کو کانگریس میں مدغم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

وہ بہت دیر تک پھر چپ رہا — جیسے وہ کسی گہری فکر میں ڈوب گیا ہو —

"پچھلے ۳۵ سالوں میں پاکستان میں ایک بھی ڈھب کا الیکشن نہیں ہوا — حالانکہ پاکستان بننے سے پہلے کمیونسٹ جب پاکستان بننے کے بارے میں بات کرتے تھے تو یہی کہتے تھے کہ پاکستان میں انقلاب ہندوستان سے پہلے آئے گا — یار کہتے ہیں پاکستان میں سرِ راہ کوڑے لگتے ہیں شراب پینے والوں کو — سالا فیض احمد فیض اچھا رہا جو پاکستان سے بیروت بھاگ گیا — لیکن یار اگر بیروت والے کوڑے برسانے لگے تو وہ سالا کدھر بھاگے گا۔

بات چلی تھی الیکشنوں کی — یار یہ شراب کا نشہ کہاں سے کہاں لے جاتا ہے — ہاں تو میں کہہ رہا تھا یہاں سالے کون سے ٹھیک الیکشن ہوتے ہیں۔ وہی ذات — وہی پات وہی برادری وہی مذہب — یار و یہ مذہب بھی عجیب بیماری ہے جسے لگ جاتی ہے نا — اس کی جان ہی لے کر چھوڑتی ہے۔ ہمارے محلّے میں تھے اختر حسین — سالا ہندوؤں سے روپے لے کر مسلمانوں کو بُرا

بھلا کہتا تھا ۔ مسلمانوں سے روپے لے کر ہندوؤں کو گالیاں دیتا تھا۔ کہنے کو نیشنلسٹ مسلمان تھا دل سے مسلم لیگی تھا اور انگریزوں کا ایجنٹ تھا۔ آٹا مل میں سیٹھ دیوان کا حصّہ دار تھا جہاں گیہوں میں مونگ پھلی کا چھلکا ملایا جاتا ہے اور پیس کر آٹا بناتے ہیں اب سُنا ہے اس مل میں کسی وزیر کے حصّے ہیں اور اب یہ بھی سُنا ہے کہ آٹے میں مونگ پھلی کا چھلکا زیادہ ہوتا ہے اور گیہوں کم۔

وہ سالا اختر حُسین پاکستان میں شیعہ سُنّی کے فساد میں مارا گیا۔

بڑا ایک پوا ارسٹوکریٹ ۔ اُس نے گرجتے ہوئے کہا ۔ وہ ایک بوتل ختم کر چکا تھا ۔ یہ سالی شراب جب اندر جاتی ہے تو ایک کھلبلی سی مچ جاتی ہے دماغ میں۔ لاکھ سوچتا ہوں کہ پینے کے بعد جھوٹ بول کر دیکھوں ۔ سالا جھوٹ زبان پر ہی نہیں آتا اور اگر اسی طرح سچ بولتا جاؤں تو لوگ پھانسی پر چڑھا دیں گے ۔ وہ سالا چڑھے گا سولی پر۔ سچ لگ گیا ہے اس کے منہ کو۔ تم تو آئے ہو نوکری کرنے گل آزار انڈسٹری میں۔ بھئی میں اس کے مالک کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ ہمارے دوست کے رشتے داروں کی فیکٹری ہے ۔ ویسے تم پاکستانی ایجنٹ کیوں نہیں بن جاتے میرا ایک وزیر دوست ہے وہ سالا کچھ ایسا ہی دھندا کرتا ہے۔ ایک بار آیا تھا گھر پر اور کچھ کاغذات دے کر مجھے کسی عبدالرحمٰن کا پتہ دے گیا تھا ۔ میں نے تو کھولے نہیں تھے وہ کاغذ ۔ لیکن میری بیوی کو کچھ شک ضرور ہو گیا تھا۔ میں جب باہر گیا تھا تو اس نے کھول لیا تھا لفافہ ۔ وہ سالا اُردو میں تھا اس کے کچھ پلے نہیں پڑا۔ ورنہ ۔ ورنہ ۔ وہ سالی بھی کچھ اُلٹے دماغ کی ہے میرے رشوت کے روپے محلّے کے غریبوں میں بانٹ دیتی تھی ۔ اپنے یار کی اور میری بیوی میں کچھ کُھسر پُھسر ضرور ہوتی رہتی ہے۔ وہ کچھ پٹی پڑھاتا رہتا ہے اسے۔

اور وہ سالی بھی اس کی باتیں بہت دھیان سے سُنتی ہے اور اثبات میں سر بھی ہلاتی رہتی ہے — اور تو اور میرا بڑا لڑکا اور منجھلی لڑکی بھی بہت دھیان سے سُنتے ہیں اس کی باتیں — سالا گھر کا گھر میرے خلاف کر رکھا ہے اُس نے۔ پرسوں ہی کی بات ہے لڑکی کہنے لگی — "پاپا آپ رشوت کیوں لیتے ہیں۔ اتنی شراب کیوں پیتے ہیں — انکل کو پھانسی پر کیوں چڑھانا چاہتے ہیں۔ اگر انہیں پھانسی لگ گئی تو —"

تو میں ابھی سے رشوت لینا چھوڑ دوں گا — سارا روپیہ غریبوں میں بانٹ دوں گا — شراب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا — " اور وہ سہم سی گئی تھی۔

بیرے نے پوّا لا کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا — وہ بہت دیر تک پوّے کو ادھر ادھر سے گھما پھرا کر دیکھتا رہا پھر اُس نے ڈھکنا کھول کر اس میں سے آدھی شراب گلاس میں انڈیل لی۔

وہ حفیظ جالندھری ہے نا — جس نے پاکستان کا قومی ترانہ لکھا ہے۔ سالا کل تک انگریزوں کے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ میں گانے لکھتا تھا " اڑ دس بڑوسن کیہ جو کہیں تو تیوں رے کو بھرتی کرا آئی رے" — سالا بڑا ابن الوقت باز ہے — جوش ملیح آبادی نے ایک رباعی لکھی تھی — وہ کیا تھی سالی — ساری رباعی تو یاد نہیں آ رہی ہے —

"اسلام کا شاہی سے تعلق کیا ہے"

اب سُنا ہے جوش ملیح آبادی بیٹے کی دکان پر بیٹھ کر ملیح آباد کے باغوں کے سپنے دیکھتا ہے صبح پنگھٹ کی نیم کے نیچے بیٹھ کر مائکے کی گھٹائیں یاد کرتا ہے — مرے گا سالا — پھانسی لگے گی اُسے — مصلوب ہو جائے گا۔

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا

تو یار گھڑی دیکھتا ہے۔ ابھی سوا نو بجے ہیں — رات اپنی ہے۔ جیب

میں پیسے ہوں تو جنت کا دروازہ بھی رات بھر کھلا رہ سکتا ہے —— پچھلے دنوں خبر بڑی گرم تھی کہ باچھی سالا کباب بہت کھاتا ہے جامع مسجد کے پاس کسی ہوٹل میں ۔ تجھے شاید بھوک لگی ہے ۔ چل نکڑ والے ڈھابے پر تجھے اڑد کی دال کھلائیں گے —— دال بہت اچھی بناتی ہے وہ کالی کلوٹی لیکن یار جسم بہت گدرایا ہوا ہے اس کا اور آنکھیں ہیں پیئے ہی نشہ ہو جائے اگر وہ ایک آدھ منٹ کو بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دے ۔ سالی نالتو بات ہی نہیں کرتی —— یار ہم کچھ جلدی پیدا ہو گئے ورنہ یہ سالی بھٹیارن —— سُنا ہے اس علاقے کے سوشل ورکر کی رکھیل ہے —— چل آج وہیں کھانا کھائیں گے ——

میں اٹھا تو اس نے پھر اشارے سے مجھے بٹھا دیا —— وہ راجندر سنگھ بیدی ہے نا —— بڑی خوبصورت کہانیاں لکھتا تھا —— سُنا ہے اب سالا گھٹیا گھٹیا فلمیں بناتا ہے اور احمد عباس رُوسی سرکس کی ایک برانچ بمبئی میں کھول رہا ہے

"چل یار کھانا کھائیں "۔

ہم اٹھ ہی رہے تھے کہ ایک آدمی بھاگا بھاگا آیا ۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا ۔ اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی ۔ وہ ٹھیک سے بول نہیں پا رہا تھا —— آنے والے نے اسے کندھوں سے پکڑ لیا اور وہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کہہ رہا تھا —— وہ تیرا دوست —— تیرا دوست تھا نا —— جو تمہارے پاس —— بیٹھا شراب پی رہا تھا —— اسے جیپ نے کچل دیا —— وہ گلزار اٹھ سٹریز کے مالک کے گھر پہنچ گیا تھا —— ہاں —— شادی تھی —— مالک کی لڑکی کی —— اس نے گانے والی کے ہاتھ سے مائیکروفون چھین لیا تھا —— اور نہ جانے کیا کیا بولنے لگا تھا —— برات میں ہنگامہ ہو گیا ۔ مالک بگڑ گئے —— گالی گلوچ ہونے لگی

پھر۔ پھر وہ رونے لگا۔

"میں نے کہا تھا۔ سالا مرے گا۔ پھانسی لگ جائے گی۔ سولی چڑھے گا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے مہاتما بدھ کی طرح ہاتھ اٹھا کر مجھے چپ کرا دیا۔ "مجھے یقین تھا وہ سالا ضرور جائے گا وہاں۔ بن بُلائے جائے گا۔ یہ گل آزار انڈسٹری والے بڑے کمینے ہیں۔ اس کی ساری جمع پونجی اپنے کاروبار میں لگوادی تھی۔ اور نوکر بھی رکھ لیا تھا۔ جب روپے کما لئے تو اسے ٹھینگا دکھا دیا۔ مجھے یقین تھا سالا سچ بولے گا اور مرے گا۔

اُس نے پورے میں بچی شراب کو حلق میں انڈیل لیا اور کہا چل ان سالوں سے مل آئیں۔ وہ تیز تیز قدموں سے اس پنڈال کی طرف جا رہا تھا جہاں اب بھی بہت سہانے سروں میں کوئی انگریزی دھن بج رہی تھی جہاں رنگ برنگی کاروں کا تانتا بندھا تھا۔ جہاں آسمان کے تاروں سے زیادہ بجلی کے بلب جگمگا رہے تھے۔ جہاں طرح طرح کے لذیذ کھانوں کی مہک بھرے پیٹ لوگوں کو بھی بھوک محسوس کرا رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا

"اس کے رشتے دار کہتے ہیں میں نے اسے بُرے راستے پر ڈال دیا۔ میں نے اسے شراب پینا سکھا دی اور میں نے ہی اسے سچ کی لت ڈال دی۔ لو صاحب یہ بھی خوب رہی۔ ہم تو سالا اس آدمی کو پوجتا ہے کہ وہ سچ بولتا ہے اور ادھر یہ الزام کہ ہم اس کو سچ بولنا سکھا دیا۔ بھلا صاحب آپ بتلاؤ کہ ہم شام سے آپ کے ساتھ ہیں آپ ہی بتلائیں ہم نے یہ انگارہ منہ سے اگلا ہے۔ یہ سچ تو سالا ہونٹ جلا دیتا ہے۔ سچ تو دشمن بنا دیتا ہے سب کا۔ ادھر آپ نے سچ بولا نہیں ادھر لوگوں نے صلیب گاڑی نہیں۔ نہ بھی ہم نے یہ پاپ کبھی پالا نہیں شیرنا۔ مگر پیتا ہے سچ سُننے کو اور بولنا کو جا کی قسم بڑے

جو کھم کا کام ہے۔ کھال کھینچ لیتے ہیں دنیا والے ۔ اگر میں نے سچ بولا ہو تو منہ پر تھوک دو میرے ۔

جب ہم خوبصورت پنڈال کے پاس پہنچے تو گل زار انڈسٹری کا مالک کسی انکم ٹیکس کے بڑے افسر کو "شواز ریگل" پلا رہا تھا اور ہمیں دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگی تھی ۔ میں نے اسے یہ کہتے سنا تھا ۔ "مجھے معلوم تھا یہ سور کا بچہ بھی یہاں آئے گا ۔ پھر اس نے کچھ اشارہ بھی کیا تھا ۔

پھر کچھ غنڈے اس پر ٹوٹ پڑے تھے اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہے۔ غنڈے اُسے اٹھا کر پنڈال سے پرے لے جا چکے تھے ۔ میں وہاں کھڑا زرق برق پوشاکوں میں ان عورتوں کو دیکھ رہا تھا جن کے چہرے پر وقت نے کشیدہ کاری تو کر دی تھی لیکن یہ سالے میک اپ کا سامان بنانے والے بھی بہت گھاگھ ہیں ۔ نیم برہنہ لڑکیاں آنکھوں سے اور خوبصورت ہاتھوں سے شراب بانٹتی پھر رہی تھیں اور اندھیرے میں سے کسی کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی ۔ "اس کے منہ کو سچ لگ گیا ہے ۔ سالا پھانسی لگ جائے گا ۔ سولی چڑھے گا ۔"

تحفہ

پچھلے برس تک تو گوپی کی شرارتیں قصبے والوں کے لئے قابلِ برداشت تھیں لیکن عمر کے ساتھ ساتھ اب اس کی شرارتیں بھیانک شکل اختیار کر گئی تھیں۔ اس کے باپ کے پاس تھوڑی سی زمین تھی جس میں وہ کھیتی باڑی کرتا تھا۔ پانچ چھ گائیں پال رکھی تھیں جن کا دُودھ وہ سینی ٹوریم میں سپلائی کرتا تھا اس کے علاوہ تین بکریاں تھیں۔ بس یہی ان کا کُل اثاثہ تھا۔

اس کے ماں باپ اسے مار پیٹ کے ہار چکے تھے۔ ساری رات بھوکا رکھ چکے تھے۔ رسیوں سے باندھ کر اُسے کمرے میں بھی ڈالا گیا لیکن نہ جانے اس کے دماغ میں کون سا فتور تھا کہ اِدھر رسیاں کُھلیں اُدھر اُس کے من میں شرارت نے جنم لیا۔ شکل معصوم تھی۔ چہرے پر اتنا بھولپن کہ اسے سامنے بٹھا کر پہروں دیکھتے رہو۔ وہ ہمیشہ کسی مندر کی مورتی کی طرح شانت نظر آتا تھا لیکن اس کے کارنامے سُن کر شیطان بھی کانوں میں انگلیاں ڈال لے۔ اس کے دماغ میں شرارت بلاوجہ نہیں جاگتی تھی۔ ہاں کسی نے بھولے سے کچھ کہہ دیا تو بس ......

منموہن پنڈت نے ایک بار اسے مندر سے دھتکار دیا اور پرشاد نہیں دیا تھا۔ بس اسی شام کو ہی وہ کتھا سُننے والوں میں یوں آکر بیٹھ گیا جیسے تلسی داس کی چوپائیوں کا آنند لوٹنے آیا ہو۔ پنڈت جی نے اپنے مسند پر پہلے

رامائن کے بستے کو جھک کر پرنام کیا اور پھر جب ہمہ تن گوش بھگتوں کے سامنے اسے کھولا تو ایک بڑا سا مینڈک پھدک کر سننے والوں میں جا پڑا۔ پنڈت جی چوکی سمیت سندر سے نیچے گر گئے اور گوپی غائب۔ یہ تو سب کو پتہ تھا کہ ایسا کام گوپی ہی کر سکتا ہے لیکن وہ کب مندر میں گھسا۔ کب پنڈت جی کی آنکھ بچا کر رامائن کا بستہ کھولا۔ کب مینڈک کو اس میں باندھا ۔ یہ کسی کو تو کیا مندر میں ہرا جمان بھگوان کی مورتی کو بھی پتہ نہ چل سکا تھا۔

ایک بار دامودر حلوائی سے جلیبی لیتے وقت نہ جانے اس سے اچھی طرح پکڑی نہ گئیں یا حلوائی سے اچھی طرح تھمائی نہ گئیں جلیبیاں زمین پر گر گئی تھیں اور اس بات کو لے کر جھگڑا ہو گیا تھا۔ بس اسی پر اس نے رات کو دامودر حلوائی کی بھٹی میں زوردار پٹاخہ چھپا دیا اور جب بھٹی میں کوئلوں کو آگ دی گئی تو ایک دھماکے سے بھٹی کہیں اور کوئلے کہیں۔ آگ دینے والا بھی پچھاڑ کھا کر گرا۔ ویسے گوپی پٹتا تو رہتا ہی تھا لیکن جب دامودر کی بھٹی ایک ہی دھماکے سے بیچ بازار میں آ رہی تو معاملہ پولیس تک پہنچا۔ پولیس والوں نے اسے مکئی کے کھیتوں میں جا لیا۔ جب پولیس اسے پکڑ کر گھر اس کے ماں باپ کے پاس لے گئی تو انہوں نے گھبرانے کی بجائے خود ہی سنتری سے کہا تھا کہ وہ ان کے بس کا تو ہے نہیں آپ ہی سنتری جی اسے ٹھیک کر دو۔

سنتری نے گوپی کو دھکیلتے ہوئے کہا۔ "فکر نہ کرو مہاشے۔ تھانے میں تو بڑے بڑے ٹھیک ہو گئے۔ یہ کل کا چھوکرا کس کھیت کی مولی ہے۔"

گوپی تھانے میں پہنچا تو تھانیدار اس کی معصوم شکل دیکھ کر پہلے سنتری پر بگڑا لیکن پھر ساری بات سن کر لال لال آنکھوں سے گوپی کی طرف دیکھا اور اس کو فرش پر بٹھا کر پھر کسی معاملے میں الجھ گیا۔ اسے یاد ہی نہ رہا کہ گوپی بھی تھانے

میں بیٹھا ہے۔ کام سے فارغ ہو کر رات کے نو بجے اس کی نظر گوپی پر پڑی جو دیوار سے ٹیک لگا کر بھوکا ہی سو گیا تھا۔ تھانیدار کا جی اس وقت گیارہ بارہ سال کے بچے کو جگانے کو نہ چاہا اور "صبح دیکھیں گے" کہہ کر وہ گھر چلا گیا۔ ادھر صبح کا تھکا ہارا سنتری اپنے کپڑے بدل پیٹی کھونٹی پہ ٹانگ جلد ہی خراٹے بھرنے لگا۔

صبح سنتری کی آنکھ کھلی تو گوپی اس وقت سنتری کا کمبل اوڑھے گہری نیند میں سویا ہوا تھا۔ سنتری ضروری حاجات سے فارغ ہو کر جب وردی پہننے لگا تو پیٹی غائب تھی۔ سنتری کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے پاگلوں کی طرح سارا تھانہ کھوج ڈالا۔ کمبل اٹھا کر گوپی کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن پیٹی کہیں نہیں ملی تھی۔ سنتری کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی پیٹی نہیں دماغ گم ہو گیا ہو۔ اس کی نظر بار بار گوپی پر جاتی لیکن وہ مست سویا پڑا تھا۔ سنتری تھانے کا دروازہ باہر سے بند کر کے تھانیدار کے ہاں بھاگا بھاگا گیا۔ تھانیدار نے اس معاملے کی نوعیت بھانپ کر سنتری کو تھانے پہنچنے اور گوپی پر کڑی نظر رکھنے کا حکم دیا۔ آدھ گھنٹہ بعد جب تھانیدار تھانے میں پہنچا تو سنتری کا برا حال تھا مونچھیں جھکی جھکی پگڑی آدھی کھلی آنکھیں پاگلوں کی سی۔

تھانیدار نے آتے ہی گوپی کو ٹھوکر سے جگایا اور وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا تھا۔

"بتاؤ کدھر ہے پیٹی۔" تھانیدار نے گرج کر کہا۔

"کونسی پیٹی" گوپی نے لاپرواہی سے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"سپاہی کی پیٹی۔ جو اس نے کھونٹی پر ٹانگ رکھی تھی" تھانیدار گرجا۔

گوپی نے پھر بحث نہیں کی۔ صاف صاف کہہ دیا کہ کھونٹی پر ٹنگی ایک چمڑے کی پیٹی رات کو ایک بندر اٹھا کر لے گیا تھا۔

"تم نے بندر کو روکا نہیں" تھانیدار کے منہ سے یونہی نکل گیا۔

"میں کیسے روکتا۔ اتنا موٹا تھا وہ بندر۔ منہ کھول کر اور بڑے بڑے دانت نکال کر میری طرف دیکھا تھا اس نے۔ میں نے پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور منہ دوسری طرف پھیر لیا" گوپی ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

"بکواس مت کرو۔" تھانیدار نے کہا۔

اس کے بعد گوپی کی پٹائی ہوئی لیکن اس نے بیان نہیں بدلا تھا۔ تھانیدار لاچار ہو گیا۔ اور معاملہ پر سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے اس نے گوپی کو چھوڑ دیا اور سنتری کو بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ پیٹی گم ہونے کی رپٹ ہو بہو ایسی ہی کرے جیسے گوپی نے کہا تھا۔ پندرہ دن بعد جب ضلع کے عہدہ دار وہاں تفتیش کے لئے آئے تو سنتری کو گوپی کی بہت منت سماجت کرنی پڑی۔ آدھ پاؤ جلیبی بھی کھلائی اور دو روپے دینے کا وعدہ بھی کیا۔

جب ضلع کے عہدے دار نے گوپی سے پوچھا کہ وہ رات کو تھانے میں کیا کرنے گیا تھا تو وہ کتنی صفائی سے جھوٹ بول گیا تھا "مجھے میرے باپ نے گھر سے نکال دیا تھا اس کا خیال تھا کہ حلوائی کی بھٹی میں پٹاخہ میں نے رکھا تھا۔ ٹھنڈ بہت تھی۔ سنتری صاحب تھانے میں کھڑے تھے میں نے منت کی انہوں نے مجھے ایک کونے میں پڑے رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ کچھ اس سادگی سے جھوٹ بول گیا کہ عہدہ دار کو اس کی بات کا یقین ہو گیا۔

اس دن کے بعد گوپی قصبے میں کہیں آگ بھی لگا دے تو پولیس والے اپنے کان لپیٹ لیتے۔ تابھئی نا — وہ گوپی ایسا کچھ کام کر ہی نہیں سکتا۔

ماسٹر کنہیا لال تو گوپی کے نام سے ہی کانپ اٹھتا۔ اسے یاد تھا جب گوپی سکول میں داخل ہوا تھا تو بمشکل تمام آٹھ دس دن کے لئے سکول آیا تھا۔ سبق نہ یاد کرنے پر

تو اسے ڈانٹ پڑتی ہی تھی لیکن وہ بچوں کی سلیٹوں پر بہت ڈراؤنی ڈراؤنی تصویریں بنانے کی وجہ سے ماسٹر جی کے ہاتھوں پٹا بھی تھا اور پھر ایک روز جب ماسٹر کنہیا لال سکول کے میدان میں درخت کے نیچے کلاس لے رہے تھے تو گوپی کو موقعہ ہاتھ آگیا۔ پانی پینے کے بہانے گیا اور درخت پر لگے شہد کی مکھیوں کے چھتے پر دور ہی سے غلیل چلا دی۔ سبھی بچوں کے ہاتھ منہ سُوج گئے تھے۔ ماسٹر جی کا تو بہت ہی بُرا حال ہوا۔ انہیں سکول سے پندرہ دن کی چھٹی لینی پڑی۔ اس کی شرارت کی انتہا تو بس اس روز ہوئی جب سرکس والوں کا خیمہ جل گیا۔ قصبے میں مدتوں بعد سرکس نے ڈیرا ڈالا تھا۔ ابھی ان کے خیمے وغیرہ گڑے نہ تھے۔ جانوروں کی گاڑیاں اور ہاتھی ابھی "چوگان" میں ویسے ہی کھڑے تھے۔ سارا قصبہ چاروں طرف سے پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا بس یہی ایک میدان تھا جسے چوگان کہتے تھے۔ میلے ہوں۔ دنگل ہوں یا کوئی بھولی بھٹکی نوٹنکی یا سرکس آجائے تو یہیں خیمے گڑتے۔ گوپی کو سرکس کے آنے کی خبر ملی تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ بھاگا بھاگا چوگان میں پہنچا۔ شیروں کی گاڑیوں کو جن کے آگے پھٹے لگے تھے۔ پہلے تو وہ بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر شیر کو نزدیک سے دیکھنے کا چاؤ اس کے اندر جاگ اٹھا اس نے گاڑی کا آگے کا پھٹ ذرا اوپر اٹھایا تو شیر دہاڑا۔ سرکس والے جو اپنے اپنے کام میں لگے تھے شیر کی دہاڑ سُن کر چونکے اور شیر کی دہاڑ سُن کر پھٹا گوپی کے ہاتھ سے گر گیا۔ سرکس کے ایک ملازم نے اسے دبوچ لیا۔ تین چار چانٹے ایسے رسید کئے کہ اس کے گالوں پر انگلیوں کے نشان چھپ گئے۔ مگر آنسو اس کی آنکھوں سے ایک بھی نہ ٹپکا۔

غصّے سے بھرے گوپی نے تین دن تو کاٹے مگر چوتھے دن سرکس کا بڑا خیمہ آگ لگنے کی وجہ سے راکھ کا ڈھیر ہو گیا سرکس والے تو پریشان تھے ہی۔ راکھ کے

ڈھیر اور جلے ہوئے فرنیچر کو دیکھ کر قصبے والے بھی حیران رہ گئے تھے۔ سرکس والوں کا بہت نقصان ہو گیا تھا۔ معاملے کی جانچ پڑتال بھی ہوئی لیکن کسی کے کچھ پلے نہ پڑا۔ ہاں ایک پہاڑی کی طرف سے چوگان کے پاس تک پتنگ اُڑاتے کی ڈور ضرور ملی تھی لیکن اس سے آگ کا کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ جب سرکس والوں کا قافلہ مایوسی کے عالم میں وہاں سے چلا گیا تو گوپی کے لب کھُلے کہ یہ آگ اسی نے ایک پتنگ کے ذریعہ سے لگائی تھی جس کے ساتھ اس نے باریک کوئلے سے بھری بانس کی نلی باندھ دی تھی اور نلی میں نیچے سوراخ کر کے آگ دکھلا دی تھی۔ اُڑتی ہوئی پتنگ جس سے اب آگ کی چنگاریاں بھی نکل رہی تھیں۔ سرکس کے خیمے کے اوپر پہنچا تو اس نے اسے خیمے پر گرا دیا تھا۔ دوسرے شو کے بعد سرکس والے سوئے پڑے تھے کہ آن کی آن میں پنڈال دھرتی پر آ رہا

جب یہ واقعہ لوگوں تک پہنچا تو لوگ جہاں گوپی سے گھبرانے اور ڈرنے لگے تھے وہاں اس کے دماغ کی بھی داد دیتے تھے۔ یہ بات جب گوپی کے باپ تک پہنچی تو اسے بہت صدمہ ہوا اور فوراً ہی اسے بہت زور کا بخار ہو گیا۔ وہ راتوں رات چارپائی سے لگ کر رہ گیا تھا۔ گوپی کی ماں نے ایک دو روز تو دودھ کسی پڑوسی کی مدد سے سینی ٹوریم میں پہنچایا اور جب گوپی کے باپ کا بخار نہ اترا تو اسے گوپی کی منت کرنی پڑی تھی۔ اس نے بڑے دلار سے اسے سمجھایا تھا کہ دودھ اگر سینی ٹوریم میں نہیں پہنچے گا تو سینی ٹوریم والے دودھ لینا بند کر دیں گے۔ باپو تیرا بیمار پڑا ہے۔ گھر کیسے چلے گا تیرے باپو کی دوا دارو کیسے ہوگی اور یہ بات گوپی کی سمجھ میں فوراً ہی آگئی تھی۔ گوپی مان گیا تو اس کے باپو نے بھی اُسے پاس بلا کر منت کرتے ہوئے بھگوان کا واسطہ دیتے ہوئے سمجھایا تھا کہ سینی ٹوریم میں کوئی ایسی شرارت نہ کرے جس سے ان کا لگا لگایا کام چھوٹ جائے۔ اسے مریضوں سے بھی دور رہ

دور رہنے کی ہدایت کی اور کہا کہ بیٹا وہاں سب مریضوں کو چھوت کی بیماری ہے۔ اگر ان سے گھل مل جاؤ گے تو تمہیں بھی بیماری ہو سکتی ہے۔

یہ بات گوپی سمجھا تھا کہ نہیں یہ تو وہی جانے لیکن صبح سویرے خچر پر دودھ لاد کر چلا ضرور گیا تھا۔ دودھ کینٹین میں دے کر وہ اس شیشے والی عمارت کو دیکھنے لگا جسے دور سے وہ بچپن سے دیکھتا آرہا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس کو کبھی ادھر آنے کا حوصلہ نہ ہوا تھا۔ جی تو اس کا کئی بار چاہا تھا کہ ادھر گھوم پھر آئے لیکن نہ جانے کیوں وہ وہاں کے سفید کپڑوں والے پادری سے گھبراتا تھا۔ وہ سفید کپڑوں والی نرسوں سے بھی ڈرا کرتا تھا۔ جو کبھی کبھار بازار میں سودا سلف خریدنے آیا کرتی تھیں۔ پادری کی سفید داڑھی۔ گلے میں ایک لاکٹ۔ سالٹکتا دیکھ کر وہ پہروں اس کے بارے میں سوچا کرتا تھا اور جب پادری اسے سرِراہ دیکھ کر مسکرا دیتا تو وہ اور پریشان ہو جاتا تھا۔ سینی ٹوریم تو بہت دیر تک اس کے دماغ میں سفید بھوتوں کا مرکز بنا رہا تھا۔

آج دودھ کے چھوٹے چھوٹے ڈبے اتروا کر اور خچر کو شہتوت کے پیڑ کے ساتھ باندھ کر وہ بڑی دیر تک اس بلڈنگ کو دیکھتا رہا اور پھر نہ جانے کون سے جذبے کے تحت وہ بلڈنگ میں داخل ہو گیا۔ پہلے وہ برآمدوں میں گھومتا رہا۔ بڑے بڑے کمروں میں اُجلے اُجلے بستروں پر کچھ لوگ لیٹے ہوئے تھے کچھ ناشتہ کر رہے تھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہاں کتنی خموشی ہے اور اس خموشی کو کبھی کبھی کسی کے کھانسنے کی آواز یا چائے کی پیالی کی کھنک توڑ دیتی ورنہ ایک سناٹا سا ہر طرف ایسے چھایا ہوا تھا جیسے اس رات اس پہاڑی پر تھا جب وہ پتنگ لے کر وہاں پہنچا تھا۔ جس رات سرکس کا خیمہ جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ وہ یہ سوچ کر زیرِ لب مسکرا دیا۔

جب وہ برآمدوں سے ہو کر آخری کونے میں پہنچا تو وہاں اسی کی اپنی ہی عمر کا

ایک لڑکا سفید قمیض اور پاجامہ پہنے آنکھوں پر دوربین لگائے کھڑکی میں کھڑا نظر آیا۔ گوپی کو یاد آیا کہ اس نے ایک مہتاج سے اس دو شیشوں والی چیز کا نام پوچھا تھا اور اس نے اس کا نام دوربین بتایا تھا۔ اور کہا تھا کہ اس کو آنکھوں سے لگانے سے بہت دور کی چیزیں بالکل پاس دکھائی دینے لگتی ہیں۔

وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر بڑی حیرانی سے اس لڑکے کو دیکھتا رہا جسے گوپی کے وہاں پہنچنے کا قطعی علم نہ تھا گوپی کو اس کے ہونٹ صاف دکھائی دے رہے تھے جن پر کچھ دیکھ کر خود بخود مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ گوپی کا جی چاہا کہ وہ اچک کر اس لڑکے کے ہاتھ سے دوربین چھین لے اور اپنی آنکھوں سے لگا کر دیکھے۔ یہ خیال آتے ہی وہ کھڑکی کے اور پاس ہو گیا۔ ڈرتے ڈرتے اس کی قمیض کو چھوا پھر بازو کو۔ لڑکے نے آنکھوں سے دوربین ہٹا کر گوپی کو مسکراتے ہوئے کہا " تو دیکھے گا۔

اور گوپی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لڑکے نے اپنے ہاتھوں ہی سے گوپی کی آنکھوں پر دوربین لگا دی اور کہا " وہ دیکھ اس درخت پر بیٹھے بندر کیسے ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں "

گوپی کو پہلے تو کچھ نظر نہیں آیا۔ پھر اس لڑکے نے اپنے دونوں بازو اس کے کندھے پر رکھ کر دوربین کو گھمایا اور وہ پیڑ جس پر بندر بیٹھے تھے واقعی بہت پاس آ گیا اور گوپی کا جی چاہا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر موٹے بندر کی پونچھ کھینچ لے شاید اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا بھی تھا۔

" تم یہیں رہتے ہو کیا " لڑکے نے دوربین گوپی کی آنکھوں سے ہٹا کر کہا۔

" ہاں۔ وہ گھاٹی ہے نا۔ جہاں اخروٹ کا پیڑ نظر آتا ہے۔ بس اس کے آگے موڑ کاٹتے ہی میرا گھر ہے " گوپی نے اپنے گھر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

" اور تم "

میں تو یہیں رہتا ہوں۔ مجھے روز شام کو بخار ہو جاتا ہے۔ میری ماں بھی یہیں رہتی ہے۔ پادری انکل کے اوپر والے کمرے میں" لڑکے نے کہا۔

"تم نے وہ پہاڑی دیکھی ہے" گوپی نے ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں نے کہا نا کہ مجھے شام کو بخار ہو جاتا ہے اور ڈاکٹر انکل اور میری ماں مجھے کہیں جانے نہیں دیتے۔

"تمہارے باپو"

وہ — وہ تو بہت دور رہتے ہیں۔ سمندر کے کنارے ہماری بہت بڑی کوٹھی ہے"

"سمندر کیا ہوتا ہے"

"جہاں ہم کھڑے ہیں اور جہاں تک ہماری نظر جاتی ہے۔ پانی ہی پانی ہوتا ہے"

"تمہاری کوٹھی پانی میں ہے"

"ارے بدھو وہ تو کنارے پر ہے"

"تم نے وہ پہاڑی دیکھی ہے"

"نہیں بابا نہیں"

"اُس کے پرلی طرف میدان ہے جہاں پانچ دریا بہتے نظر آتے ہیں اور ادھر پیڑوں پر اتنی میٹھی میٹھی خوبانیاں لگتی ہیں کہ صبح کھا لو تو شام تک مٹھاس رہتی ہے منہ میں"

"اچھا — تمہارا نام کیا ہے"

"گوپی — اور تمہارا"

"اشوک ـــ تم خوبانیاں کھلاؤ گے مجھے"

"ضرور ـ تم مجھے دُور بین جی بھر کے دیکھنے دو گے"

"ہاں - ہاں وہ تم ابھی دیکھ لو"

"نہیں کل دیکھوں گا ـــ میں کل خوبانیاں بھی لاؤں گا تمہارے لئے"

پھر ان کی دوستی ہو گئی تھی اور ایک دن گوپی، اشوک کو وہ پیڑ دکھانے لے گیا جہاں میٹھی میٹھی خوبانیاں لگتی تھیں اور جب سورج غروب ہونے سے کچھ ہی پہلے اشوک تھکا ہارا سینی ٹوریم واپس آیا تھا تو اس کی ماں - ڈاکٹر - نرسیں اور پادری انکل سب بہت پریشان سے ادھر ادھر گھوم رہے تھے - گوپی معاملے کو بھانپ کر گیٹ ہی سے لوٹ گیا تھا - اشوک پسینہ پسینہ ہو رہا تھا اس کی ماں اسے دیکھ کر آنسو نہ روک سکی اور پادری نے سینہ پر صلیب کا نشان بنایا نرسوں نے سکھ کا سانس لیا اور پھر فوراً ہی اشوک کی ماں اسے کمرے میں لے گئی - اور بستر پر لٹا دیا - اسے بہتیرا کہا گیا کہ وہ کھانا کھا لے اس نے نہیں کھایا اور اس کے بعد اسے نیند آ گئی -

صبح جب اس کی آنکھ کھلی اور اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا - پادری انکل گوپی کو کچھ کہہ رہے تھے جو دودھ دینے آیا تھا - اشوک کا جی چاہا کہ وہ بھاگ کر جائے اور پادری انکل سے کہہ دے کہ اس میں گوپی کا کوئی قصور نہیں - وہ خود ہی گوپی کو مجبور کر کے لے گیا تھا - وہ یہ سوچ کر اپنے بستر سے اٹھا بھی لیکن اسی وقت اس کے کمرے میں اس کی ماں نرس اور ڈاکٹر آ گئے - ڈاکٹر نے چارٹ دیکھا اور ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی - "میڈم بالکل نارمل رات اشوک کو بخار نہیں ہوا"

اشوک سارا دن گوپی کے بارے میں سوچتا رہا - کیا اب وہ اس سے ملنے

نہیں آئے گا۔ پادری انکل نے ضرور اسے ڈانٹا ہوگا۔ وہ خود کو کوسنے لگا کہ کیوں وہ ضد کر کے گوپی کو پہاڑی پر لے گیا تھا۔ وہ آنکھوں پر دوربین لگائے پہروں اخروٹ کے پیڑ کو دیکھتا رہا جہاں سے سڑک کا موڑ کاٹتے ہی گوپی کا گھر تھا۔

پادری انکل جب ہنستے ہوئے اس کے کمرے میں آئے تھے تو اس کا جی چاہا تھا کہ ان کے گلے میں لٹکا ہوا لاکٹ کھینچ کر دُور پھینک دے۔

"تم کل کدھر گئے تھے بیٹا"

اشوک نے پہلے تو سوچا کہ وہ کوئی جواب ہی نہ دے لیکن جب پادری انکل اس کے ماتھے سے بالوں کی لٹ پرے کر کے ہنستے ہوئے بولے "گوپی تمہارا دوست ہے کیا" تو خود بخود اس کے ہونٹوں سے بہت زور سے ہاں نکل گئی اور پیشتر اس کے کہ وہ پادری انکل سے کچھ پوچھے انہوں نے خود ہی کہا "وہ آج دوپہر کو آئے گا ـــ تمہارے ساتھ گھومنے بھی جائے گا۔ لیکن بیٹا سورج غروب ہونے سے پہلے لوٹ آیا کرو۔ ان پہاڑیوں میں چیتے بہت ہیں۔"

اشوک کو گوپی کے ساتھ اونچے نیچے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر گھومنا بہت اچھا لگتا۔ جھاڑیوں سے جنگلی پھول توڑتے ہوئے کانٹا چبھنے پر انگلی سے بہتے خون کو چوسنے میں اسے بہت مزا آتا تھا۔ گلہری کے پیچھے بھاگنے۔ پیڑ پر فاختاؤں کے انڈے دیکھنے۔ پیڑ کے تنے کے شگاف میں ہاتھ ڈال کر طوطے کے بچے تلاش کرنے میں۔ جھاڑیوں میں چھپے خرگوش کو بھاگتے دیکھ کر بن مرغے کی آواز سن کر وہ بے حد خوشی محسوس کرتا تھا۔

جھرنوں کا شفاف اور گنگناتا پانی۔ جھیل میں رنگ برنگی مچھلیاں۔ دُور سے آتی ہوئی گڈریے کی بانسری کی مدھر تان، نیلے آسمان پر تیرتے ہوئے بگلوں سے بھی اُجلے اُجلے بادل یہ سب کچھ دیکھ کر بھول جاتا کہ اسے شام کو بخار ہو جاتا ہے

اسی طرح گھومتے پھرتے مہینوں بیت گئے۔ اشوک کے گال گلابی ہونے لگے۔ اور ایک دن ان کا رنگ بالکل ان انار کے دانوں کی طرح سرخ ہو گیا تھا جو اکثر شام کو وہ جھاڑیوں سے توڑ کر پتھر پر پھوڑا کرتے تھے۔ اشوک کو اب کبھی بخار نہیں ہوا تھا اور گوپی بھی سب شرارتیں بھول چکا تھا۔ نہ جانے وہ دونوں کونسی دنیا میں کھوئے رہتے۔ وہ پہاڑیوں پر بیٹھ کر دوربین سے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں رواں دواں زندگی کی چہل پہل دیکھتے۔ اُفق پر پہروں دوربین لگائے بیٹھے رہتے۔ ان کا خیال تھا کہ سفید سفید بادل وہیں کہیں سے جنم لیتے تھے۔

کل شام جب گوپی اور اشوک کچی ناشپاتیاں کھاتے اناروں کو پتھروں پر کوٹ کر ایک دوسرے کے منہ میں رس ٹپکاتے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ اشوک کی نظر سامنے والی پہاڑی پر ٹک گئی اور پھر جب اس نے دوربین لگا کر دیکھا تو بہت خوش ہوا تھا۔ پہاڑی پر چیتا اور مادہ چیتا اپنے دو بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ دُوربین کے محدب شیشے میں سے چیتے کی مونچھوں کے بال تک دکھائی دے رہے تھے۔ "دیکھ گوپی دیکھ" اشوک نے گوپی کی آنکھوں پر دوربین لگاتے ہوئے کہا۔ "دیکھ کتنے خوبصورت بچے ہیں۔"

لیکن جلد ہی ان کی توجہ ادھر سے ہٹ گئی اور وہ دونوں ایک بن مرغے کے پیچھے بھاگنے لگے جو ابھی ابھی پاس کی جھاڑی سے اُڑ کر دوسری جھاڑی میں جا چھپا تھا۔

"گوپی اگر وہ رنگ برنگا طوطا جو پرسوں تمہارے ہاتھ سے اُڑ گیا تھا مجھے مل جائے تو میں اُسے ساتھ لے جاؤں گا۔"

اشوک نے شام کو سینی ٹوریم جاتے ہوئے گوپی سے کہا۔

"اشوک۔ تم جا رہے ہو کیا؟" گوپی نے اُداس ہو کر کہا۔

"ہاں گوپی پتا جی اگلے ہفتے آئیں گے۔ ان کا خط آیا ہے اور ڈاکٹر انکل نے

بھی کہہ دیا ہے کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں"

یہ بات سُن کر گوپی کا دل دھک سے رہ گیا اس کا جی چاہا تھا کہ وہ ابھی وہاں سے بھاگ جائے۔ اشوک سے بات بھی نہ کرے۔ لیکن دوسرے دن وہی بھاگ دوڑ وہی کھٹے میٹھے پھلوں کا رس نہی اُفق میں بادلوں کے گھر کی تلاش وہی بن مرغوں کی چہکار۔

ایک شام جب گوپی سینی ٹوریم پہنچا تو وہاں بہت بڑی بادامی رنگ کی کار کھڑی تھی اور جب وہ اشوک کے کمرے میں گیا تو اشوک کی آنکھیں بھیگی بھیگی تھیں۔ وہ گوپی کو دیکھتے ہی کھڑکی سے کود کر باہر آگیا تھا" دیکھ گوپی میرے پتاجی آئے ہیں۔ ہم کل صبح چلے جائیں گے۔ گوپی تم بمبئی آؤ گے نا تم بولتے کیوں نہیں گوپی۔ پھر اشوک کا گلا رُندھ گیا تھا" میں جاتی بار اپنی دُوربین تمہیں دے جاؤں گا۔ وہ ناچنے والی گڑیا بھی۔ جو تمہیں بہت پسند ہے۔ میں بمبئی کا پتہ دے جاؤں گا۔ تم خط لکھوا بھیجنا۔ میں تمہیں ضرور جواب دوں گا" اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

گوپی سوچ رہا تھا دُوربین سے بھی تو وہ اشوک کا گھر نہیں دیکھ سکتا کیونکہ اشوک نے اسے ایک روز بتایا تھا کہ دُوربین اتنی دُور نہیں دیکھ سکتی۔ گوپی پریشان تھا کہ وہ اتنے ڈھیر سارے سوالوں کا کیا جواب دے۔ وہ رونا چاہتا تھا اور شاید یہی ان سوالوں کا جواب تھا۔

اشوک کے پتاجی نے گوپی سے بہت پیار کیا اور ڈھیر سارے چاکلیٹ۔ ڈھیر ساری مٹھائی اس کے آگے رکھ دی تھی لیکن آج چاکلیٹ کا کیلا میٹھا سواد بھی اسے نہ رِجھا سکا۔ اشوک نے سبکیاں لیتے ہوئے دوربین گوپی کے گلے میں ڈال دی۔ اور ناچنے والی گڑیا کا ڈبہ اسے تھماتے ہوئے وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ پادری انکل اشوک کی ماں اور اس کے پتاجی کی بھی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ چپ تھا تو بس گوپی

جو نہ رو رہا تھا نہ بول رہا تھا۔ وہ اشوک کے آنسوؤں سے بھی بے خبر کہیں کھویا ہوا تھا اور پھر وہ گڑیا کا ڈبہ اٹھا کر دُوربین گلے میں لٹکا کر اپنے گھر کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چل پڑا۔ اشوک بہت دیر تک کھڑکی میں سے اسے دیکھتا رہا۔ روتا رہا اُس نے دیکھا گوپی اپنی آستین سے آنکھیں پونچھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ گوپی جب مڑ کر سینی ٹوریم کی طرف نہ دیکھتا تو اشوک کے آنسو نکل آتے۔ اسے اپنے گلے میں کچھ اٹکا اٹکا سا محسوس ہوتا تھا۔ آخر جب وہ اخروٹ کے پیڑ والا موڑ مڑا تو اشوک نے مُنہہ تکیہ میں دے لیا۔

گوپی جب سینی ٹوریم سے چلا تو اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے پاؤں بوجھل ہیں۔ وہ گڑیا جسے وہ ہتھیلی پر رکھ کر نچایا کرتا تھا آج پتھر کی مورتی بن گئی تھی اور کتنی وزنی ہو گئی تھی۔ گلے میں پڑی دُوربین جیسے دوربین نہ ہو بلکہ گڈے کا پہیہ ہو۔ وہ آنکھوں سے کم اور دل سے زیادہ رو رہا تھا۔ اُسے یہ بھی دُکھ تھا کہ اس کے پاس اشوک کو دینے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ وہ یہی سوچتا سوچتا گھر پہنچ گیا۔ چیزیں ایک طرف رکھ کر رونے لگا۔ روتے روتے اس کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ ماں نے رونے کے لئے پوچھا تو وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ آج پہلی بار اس کی ماں نے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی دیکھی تھی۔ اس کی ماں سب چیزیں دیکھ کر بھانپ ضرور گئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی اشوک سے بہت دوستی ہو گئی تھی۔ وہ اکثر اشوک کو لے کر گھر آیا کرتا تھا۔ گوپی کی ماں نے خوبانی کے پیڑ پر ان کے لئے جھولا ڈال دیا تھا جس کی ہر ہلور سے ڈھیر ساری خوبانیاں دھرتی پر آ گرتی تھیں۔ ماں نے گوپی کو بہت تسلّی دی لیکن وہ اسی طرح روتا رہا اور بغیر کچھ کھائے پیئے چارپائی پر لیٹ گیا۔ نیند اسے نہیں آ رہی تھی وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اشوک کو کیا دے اس کے پاس تو دینے کو کچھ بھی نہ تھا۔ اس کا دل بیٹھنے لگ گیا۔ آدھی رات تک وہ سوچتا رہا پھر اچانک

اس کی آنکھوں میں ایک چمک آگئی۔ رات کے اندھیرے میں اس نے بجری کھولی اور ایک کمبل اوڑھ کر گھر سے نکل گیا۔

سارا قصبہ تاریکی اور خموشی میں ڈوبا ہوا تھا فقط گیدڑوں کے چلانے کی آواز دور پہاڑیوں کے جنگل سے آرہی تھی۔

پو پھٹنے سے پہلے اس نے اشوک کے کمرے کی کھڑکی پر دستک دی۔ شاید اشوک گہری نیند میں سو یا تھا اس نے پھر زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن اشوک نہیں جاگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اشوک کو کیسے جگائے کہ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے دیکھا گرجے کی مدھم روشنی میں پادری انکل کھڑے تھے وہی ہنستا ہوا چہرہ وہی دل لبھانے والی مسکراہٹ۔

"اشوک سے ملو گے"؟

"ہاں انکل"

پادری انکل نے ٹارچ جلائی "ارے یہ تیرا چہرہ تو لہولہان ہو رہا ہے۔ تجھے کیا ہوا گوپی۔ ارے تو تو بری طرح گھائل ہے۔ ڈاکٹر ڈاکٹر"

رات کے سناٹے میں ان کی آواز ایک چیخ کی طرح سنائی دی اور ڈاکٹر بھاگا بھاگا سونے کے لباس ہی میں برآمدے میں پہنچ گیا۔ نرسیں ڈیوٹی چھوڑ کر باہر بھاگ آئیں۔ مریض کھڑکیوں سے باہر جھانکنے لگے۔ اشوک کے ممی ڈیڈی بھی وہاں آگئے۔ اشوک بھی آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا۔ گوپی کے چہرے اور ہاتھوں سے خون بہہ رہا تھا۔

"تجھے کیا ہوا ہے گوپی — تیری یہ حالت کیسے ہو گئی — ڈاکٹر۔ اسے دیکھو — اس کی مرہم پٹی کا انتظام کرو — " اشوک نے کہا۔

اشوک نے کھڑکی کھولی "گوپی" وہ اسے دیکھ کر چلا اُٹھا۔

گوپی نے جلدی سے اپنا کمبل اشوک کے کمرے میں پھینک دیا اور سب کے نرغے سے نکل کر اس پگڈنڈی پر بھاگتا چلا گیا جو اس کے گھر کی طرف جاتی تھی۔

کمرے میں ایک چھوٹا سا چیتے کا بچہ کمبل پر بیٹھا ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا

دردِ مشترک

چندر کلی چند ہی دنوں میں بلبیر کور سے گھل مل گئی تھی - ویسے چندر کلی افسروں کی بیویوں اور افسروں سے بہت گھبراتی تھی۔ لیکن بلبیر کور سے نہ جانے کیوں اسے کچھ لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ بلبیر کور چندر کلی کی طرح ہی خوبصورت تھی اور اس کے ہاں بھی چندر کلی کی طرح کوئی بچہ نہیں تھا۔ یہ بات بلبیر کور نے چندر کلی کو بہت دُکھ بھرے دل سے بتلائی تھی۔

چندر کلی کا خاوند چھجو رام دفتر میں چپراسی تھا۔ لیکن دفتر میں نہ ہی پوزیشن تھی جو بڑے صاحبوں کے پرسنل اسسٹنٹ کی ہوتی ہے چھجو رام پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن دفتری کام کا...... اس کی طبیعت سے کچھ ایسا میل کھا گیا تھا کہ اس کے بہت سے سرکلروں کے نمبر تک یاد تھے اور ان میں درج ہدایات اسے زبانی یاد تھیں۔ اسے اپنے افسروں کی ترقی اور تبادلوں کے امکانات کا پتہ رہتا تھا۔ پینتیس چھتیس سال کا یہ چپراسی افسروں کو کیسے بس میں کر لیتا تھا اس کے بارے میں کئی کہانیاں مشہور تھیں لیکن ان میں کون سی سچی ہے اور کون سی جھوٹی یہ چھجو ہی بتا سکتا تھا۔ جو بھی افسر آتا وہ چھجو کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ جاتا۔ کہنے والے تو

یہاں تک کہہ دیتے کہ اُس کی خوبصورت بیوی جو وہ تین برس پہلے ٹیہری گڑھوال سے سترہ سو روپے میں مول لایا تھا اکثر صاحبوں کے گھروں میں کام کرنے کے بہانے جاتی اور پھر — پھر صاحب لوگ کہیں کے نہ رہتے — یا لوگ کہتے۔

"چھجو ٹھیکے داروں کا دلال ہے"

"چھجو افسروں کی کالی کرتوتوں کا پہرے دار ہے"

"افسر سب لین دین — یا اوپر کی کمائی چھجو کی معرفت کرتے ہیں"

"چھجو کو ہر افسر کے اعمال کی اتنی خبر ہے کہ وہ کسی بھی افسر کو معطل تو کیا ڈسمس بھی کروا سکتا ہے"

"چھجو اپنی بیوی کی کمائی کھاتا ہے"

غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ چندر کلی ہر نئے افسر کے آنے پر ایک دو روز تو اُن کی کوٹھی میں جاتی تھی ان کا سامان بھی ٹھیک ٹھاک کرواتی۔ روٹی وغیرہ بنانے میں بھی مدد کرتی تھی لیکن افسرانہ روئیے صاحبوں کی بگڑی ہوئی نیت کو بھانپ کر اُن کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیتی۔ یوں تو وہ کوٹھی سے ملحقہ کوارٹر میں رہتی تھی لیکن جہاں افسر اپنی افسری کی خو بو میں رہتے یہ بھی اپنے حسن کی مستی میں کسی کی کوئی پرواہ نہ کرتی تھی۔

چھجو کی پوزیشن جو دفتر میں تھی گھر میں اس کے بالکل برعکس تھی۔ ایک تو عمر کا فرق دوسرے وہ دبلا پتلا چندر کلی کے سامنے کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ ادھر چندر کلی کا جوان چھریرا بدن گوری چٹی ایڑیوں تک لمبے سیاہ گھنے بال۔ موٹی موٹی نشیلی آنکھیں۔ بھیگے بھیگے ہونٹ۔ لمبی گردن اور سیبوں کی طرح سرخ سرخ گال بس جی چاہتا دیکھتے ہی جائیں۔ کئی افسر اپنی بیویوں کے

ادھر ادھر ، وہ فنے پہر چندر کلی کو بہت پاس سے دیکھنا چاہتے تھے اور چندر کلی ان کے بلانے پر چلی بھی جاتی تھی لیکن اس کے تیور دیکھ کر یا حُسن کا جلال دیکھ کر چھجو ہی کی طرح کسی کی ہمت نہ پڑتی اور افسروں کی بے لبی پر جب وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی تو افسروں کے دل پر سانپ لوٹ جاتے تھے۔

چھجو شراب پینے کا بہت شوقین تھا اور افسر لوگ اسے یہ موقعہ اکثر فراہم کر دیا کرتے تھے کیونکہ شراب پینے کے بعد وہ بہک جاتا تھا اور چندر کلی کے جسم کے ہر حصے کی وہ ایسی تعریف کرتا کہ افسروں کو کوک شاستر پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی اور جب اسے ایک آدھ پیگ زیادہ پلا کر کوئی اگلی بات شروع کی جاتی تو وہ کان پکڑ کر کہتا " نا صاحب نا۔ شیرنی کے پنجے کو کون ہاتھ لگائے اور افسر کھسیانے سے ہو کر رہ جاتے۔

چھجو ویسے رحم دل بھی تھا۔ جو کام کسی سے نہ ہو پائے وہ ضرور کر دیا دیتا۔ یہاں تک کہ کسی کلرک کے لڑکے کو نوکری پر لگوانا یا کسی چپراسی کے رشتے دار کو رکھوانا، کوئی بڑا ٹھیکہ یا ٹینڈر منظور کرانا۔ اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ افسروں سے وہ کیا کہہ دیتا تھا، کاغذوں میں وہ کیا کر دیتا تھا یہ تو کسی کو خبر نہیں تھی لیکن جس کام کے لئے اس نے ہاں بھر دی وہ ہو ضرور جاتا ——

جب سے نئے افسر پریتم سنگھ آئے تھے چھجو کے طور اطوار کچھ بدل گئے تھے۔ وہ اب نہ جانے کیوں اس رقم سے بھی کچھ پیسے رکھنے لگ گیا تھا جو ٹھیکدار سردار صاحب کو اس کی معرفت دے کر جاتے تھے۔ یہ عادت چھجو میں پہلے کبھی نہیں تھی۔ صاحب خوش ہو کر اسے کچھ دے دلا دیں تو اور بات تھی۔ وہ بے ایمانی نہیں کرتا تھا۔ یہ تبدیلی اس میں ابھی ابھی آئی تھی۔

اب تو وہ ٹھیکداروں سے بھی کچھ ٹھہرانے لگا تھا۔ کام کروانے کا بھی کچھ مانگنے لگا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جب سے سردار صاحب آئے تھے اسے اپنی جیب سے پینا پڑتی تھی اور شراب اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔

دوپہر کو جب سردار صاحب دفتر چلے جاتے تو چندر کلی بلبیر کور کے پاس آ بیٹھتی۔ کھانا بھی پکا دیتی اور بلبیر کور کی ٹانگیں بھی دبا دیتی جانے کیوں اسے بلبیر کور سے کچھ پیار سا ہو گیا تھا اور اس کے چکنے جسم پر مالش کرنے میں چندر کلی کو بہت مزا آتا تھا اور بلبیر کور کو بھی اس کے گھنے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیرنے میں بہت لطف آتا تھا۔ اتنے گھنے لمبے بال وہ چندر کلی سے اکثر کہا کرتی تھی "تو اسی طرح بال کھول کر آیا کر میرے پاس"

چندر کلی کھلکھلا کر ہنس دیتی اور کہتی "بی بی جی آپ تو بالکل آدمیوں جیسی بات کرتی ہو"

"چھجو جیسی" بلبیر کور کہتی۔

"ہٹو بی بی جی کیسی بات کرتی ہیں آپ"

"اچھا چندر کلی تو پھر وہ کون آدمی ہے جو کہتا ہے تم بال کھول کر آؤ" بلبیر کور پوچھتی

چندر کلی ہنس دیتی جیسے کسی نے چاندی کی گھنٹیاں بجا دی ہوں "اچھا میں چلوں۔ کہیں سردار صاحب آ گئے اور مجھے اس طرح کھلے بالوں دیکھ لیا تو کہیں پھسل نہ جائیں"

یہ دونوں تیسری چوتھی ملاقات میں ایک دوسرے سے کھل گئی تھیں چندر کلی کا قصہ سارے محکمے میں پھیلا ہوا تھا۔ اسے چنچل گھوڑی کے نام سے پکارا جاتا۔ جس کی سواری کے لئے جی تو ہر ایک کا مچلتا ہے لیکن وہ کسی

کو پیٹھ پر ہاتھ رکھنے دیتی ہو تب نا۔ جب کسی افسر کا تبادلہ ادھر کا ہوتا تو باقی سب اس افسر کو شک کی نظروں سے تو دیکھتے ہی اسے چنچل گھوڑی کو بس میں کرنے کے طریقے بھی بتلاتے۔

سردار پریتم سنگھ نے چندر کلی کو کبھی آنکھ بھر کے دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ دو چار دن چندر کلی ان کے ہاں گئی تھی تو سردار صاحب کو پاٹھ میں مگن پایا تھا۔ گرنتھ صاحب کے آگے آنکھیں بند کئے وہ نہ جانے واہگورو سے کیا دعا مانگتے رہتے اور چندر کلی اپنی پازیب کو اتار کر جیب میں ڈال لیتی۔ مبادا سردار جی کا دھیان ٹوٹ جائے اور اس کا سارا پاپ چندر کلی کے گلے پڑے

سردار صاحب ناشتے کی میز پر بیٹھتے تو ان کے لئے ناشتہ تو بلبیر کور ہی لے کر آتی تھی۔ البتہ ناشتہ تیار چندر کلی کرتی تھی۔ چندر کلی چیز تیار ہونے پر کچن کا دروازہ کھٹکھٹاتی اور بلبیر کور چائے کی ٹرے آملیٹ یا ٹوسٹ لینے کے لئے خود اٹھ کر جاتی۔ سردار جی تیار ہو کر جب دفتر جانے لگتے تو بلبیر کور کے گال ضرور تھپتھپاتے اور ان کے جانے کے بعد چندر کلی بھولپن سے پوچھتی۔ بی بی جی یہ سردار صاحب روز روز آپ کے گالوں پر چپت کیوں لگاتے ہیں۔

بلبیر کور آہ بھر کر کہتی "بس یہی تو ہے ان کے پلے۔ اور بلبیر کور کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔

چندر کلی پھر اس بات کا ذکر نہ کرتی اور دونوں تاش کھیلنے بیٹھ جاتیں۔ چندر کلی کو ڈھب سے کھیلنا تو آتا نہیں تھا لیکن پتّوں کی ہیرا پھیری کرنے اور بلبیر کور کی آنکھوں میں جھانکنے میں اسے ضرور مزا آتا تھا۔ جب کبھی بلبیر کور اس کی ہیرا پھیری پکڑ لیتی اور اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ دے کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی تو وہ اور بھی مچل جاتی اور بل کھا کر بلبیر کی گود کی گود میں جا گرتی۔ سارا صوفہ چندر کلی کے کھلے بالوں سے بھر جاتا اور بلبیر کور اس کی گدگدی کرتی اور اس کا ہاتھ چندر کلی

کے جسم پر جانے کہاں کہاں پھر جاتا۔ چندر کلی بہت دیر تک ٹھنڈی سانسیں لیتی رہتی۔ تب جاکر اس کی طبیعت بحال ہوتی۔

" چندر کلی ہاں تو پھر تجھے دیکھ کر تو خوب رال ٹپکتی تھی افسروں کی" بلبیر کور پوچھتی

ہاں بی بی جی۔ سردار صاحب سے پہلے جو سکینہ صاحب تھے وہ تو مجھے یوں گھورا کرتے تھے جیسے وہ اپنی نظروں ہی سے ـــ ایک دن جب انہوں نے اپنی بیوی کو مائکے بھیج دیا تھا اور چھجو کو ضرورت سے زیادہ پلادی تھی اور رات کو بارہ بجے انہوں نے میرا دروازہ آکھٹکھٹایا تھا۔ میں نے چھجو سمجھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔ بس لپٹ ہی گئے تھے مجھ سے کہ میں نے گریبان پکڑ کر دو چھانپڑ رسید کر دیئے تھے۔ ان کی ٹائی میرے ہاتھ میں رہ گئی تھی اور وہ اپنی کوٹھی کی طرف بھاگ گئے۔ میں نے شور مچانا ٹھیک نہیں سمجھا تھا۔ دوسرے دن جب چھجو ان کی ٹائی واپس کرنے گیا تھا ـــ دونوں پینے بیٹھ گئے تھے۔

" تو کیا چھجو تجھے شروع ہی سے ناپسند ہے" بلبیر کور نے پوچھا۔

کیا بتاؤں بی بی جی۔ باپ قرضے میں دبا ہوا تھا۔ میرا سودا کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ بی بی جی انہیں میرے چھ ہزار روپے بھی مل رہے تھے۔ کوئی بمبئی شہر کا بھڑوا تھا۔ لیکن میرا باپ نہیں مانا۔ اسے پتہ تھا کہ ہمارے علاقے سے جو لڑکیاں بمبئی جاتی ہیں وہ بازاروں میں بٹھادی جاتی ہیں۔

" چھی چھی" بلبیر کور نے کہا " واہگورو کیا ہوگا اس دنیا کا۔

" ویسے وہ بمبئی والا کہہ رہا تھا کہ وہ مجھ سے ایسا کوئی دھندا نہیں کروائے گا۔ اس کے لئے اسے سستے داموں اور بہت سی لڑکیاں مل سکتی ہیں۔ وہ تو مجھے کسی سیٹھ کے لئے لے جانا چاہتا تھا۔ جس کی کئی ملیں تھیں۔ کئی کوٹھیاں تھیں۔

اور اس کی بیوی مر چکی تھی۔ اس سیٹھ کے تین بڑے بچے تھے۔ وہ تو ان کی دیکھ ریکھ ہی کے لئے مجھے لے جا رہا تھا۔ اس نے کہا تھا سیٹھ باقاعدہ شادی کرے گا۔ لیکن بی بی جی ان کا کیا اعتبار۔ اتنی دور لے جا کر وہ جو بھی چاہے کرے۔ میرے باپ نے چھجو سے سترہ سو روپے لے کر میری شادی اس سے کر دی تھی۔" سیٹھ کے ہاں جا کر تو ٹھاٹھ ہو جاتے چندر کلی۔ سیٹھانی کہلاتی" بلبیر کور نے چٹکی لی۔

"کیا پتہ ہے بی بی جی۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اچھا چلوں بی بی جی چھجو دوپہر کے کھانے کے لئے آتا ہی ہوگا۔"

"دوپہر کو آجانا — ذرا بیٹھیں گے۔" بلبیر کور نے کہا۔

چھجو کو کھانا کھلانے کے بعد چندر کلی چارپائی پر لیٹ گئی اور سیٹھ اور بمبئی کے بارے میں اسے سوچتے سوچتے نیند آ گئی۔

بلبیر کور کھانے سے فارغ ہو کر چندر کلی کا انتظار کرنے لگی لیکن وہ بہت دیر تک نہیں آئی تو اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اسے جا کر بلا لائے۔ وہ آجائے تو پہاڑ سی دوپہر کٹ جائے لیکن وہ گئی نہیں پلنگ پر لیٹ کر ہی چندر کلی کے گدرائے ہوئے جسم کے بارے میں سوچتی رہی اور پھر چھجو کا خیال آتے ہی اس کے منہ سے "بے چاری" نکل ہی گیا۔ بھلا چھجو سے اس کا کیا میل۔

بلبیر کور کو چھجو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا جب دیکھو صاحب کے پیچھے لگا رہتا۔۔۔ سردار جی کو جو پیسے اوپر سے ملتے ہیں ان میں سے بھی کچھ نہ کچھ رکھ لیتا۔ سردار جی شریف ہیں نا اس لئے۔ میں نے تو کئی بار سردار جی سے کہا ہے کبھی پوچھو تو سہی اس مردوئے سے مگر سردار جی یہ کہہ کر ٹال گئے "چلو چھوڑو بلبیر یہ کونسی بڑی رقم مار لیتا ہے چلنے دو اسی طرح۔" اور پھر یہ سوچتے سوچتے بلبیر کور کی آنکھ

لگ گئی تھی۔

دوسرے دن دوپہر کو جب چندر کلی آئی تو بلبیر کور نے پوچھ ہی لیا۔" کیا بات ہے چندر کلی تو کل دوپہر بعد آئی ہی نہیں"

کیا کہوں بی بی جی۔ آپ ایسی باتیں چھیڑ دیتی ہیں کہ پھر بہت دیر تک جی بس میں ہی نہیں آتا۔ دیکھیے بھگوان کی قسم ہے آپ کو آج ایسی کوئی بات۔"

بلبیر کور نے اسے بازوؤں میں کھینچ لیا۔

چھوڑ دو بی بی جی۔ چھوڑ دو۔ رام قسم اگر میں نے ـــ اور پھر دونوں پلنگ پر بہت دیر تک ایک دوسرے کے گدگدی کرتی رہی تھیں۔ قہقہے بکھرتے رہے تھے دونوں کے گال سُرخ ہو گئے تھے دونوں کے جسموں پر دانتوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ پھر وہ بہت دیر تک ہانپتی رہی تھیں۔

" رات شاید سردار جی گھر نہیں تھے" چندر کلی نے چھیڑا۔

" دیکھ چندر کلی بے ہودہ باتیں نہ کیا کر ہاں۔ کل رات آئے تھے۔ پرسوں بھی آئے تھے۔ وہ تو روز رات کو ـــ تجھے کیا پڑی ہے" بلبیر کور سبکیاں لینے لگی۔

" بی بی جی آپ تو سچ مچ رونے لگیں۔ دیکھو نہ ہمارا جی جگرا۔ ہم بھی ہنس کھیل کے کاٹ رہے ہیں ـــ اب ہنس دو بی بی جی۔ نہیں تو میں آپ کے کاٹ لوں گی۔" چندر کلی نے کہا۔

نا۔ نا باؤلی سردار جی نے کہیں نشان دشان دیکھ لیا تو گھر سے نکال دیں گے۔ انہیں کیا پتہ موئی کہ تو نے کاٹا ہے" بلبیر کور نے ہنستے ہوئے کہا۔

" چندر کلی ایک بات پوچھوں " بلبیر کور نے کہا۔

" ہاں بی بی جی"

"برا تو نہیں مانے گی"

"مجھے معلوم ہے آپ کیا پوچھیں گی"

"بھلا بتا تو"

"مجھے شرم آتی ہے" چندر کلی نے کہا۔

"تو مجھے پوچھنے دو"

"آپ کو شرم نہیں آتی کیا"

"موئی آپس میں کیسی شرم"

"تو۔ پوچھو"

"کیا جوانی ایسے ہی کاٹ دو گی۔" بلبیر کور نے دلیری سے کہا

"اوئی رام۔ یہی سوال اگر میں آپ سے پوچھوں"

"سوال پہلے میں نے کیا ہے۔ اگر پہلے تو نے پوچھا ہوتا تو میں ضرور جواب دیتی" بلبیر کور نے کہا۔

"تو بی بی جی سمجھ لو جو جواب آپ دیتیں وہی میرا جواب ہے" چندر کلی نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا۔

"تو بڑی چالاک ہے ری"

ہاں بی بی جی اگر سیدھی بنی رہتی تو کیا یہ افسر لوگ مجھے چھوڑتے۔ یہ تو آئے دن اپنے دوستوں کو بلا بلا کر ـــــ"

"رام کلی جب صاحب اور چھجو دورے پر گئے تھے ایک رات ایک نوجوان ادھر آیا تو تھا ـــ کون تھا وہ" بلبیر کور نے پوچھا

"ہے ایک ٹھیکیدار کا ایجنٹ چھجو سے ملنے آیا تھا" چندر کلی نے کہا۔

"جھوٹ" بلبیر کور فوراً بولی۔

" تو وہ اتنی دیر تیرے پاس بیٹھا کیا چھجو کا حلیہ پوچھتا رہا۔ تھا تو جوان۔ خوبصورت بھی ہو گا۔" بلبیر کور نے کہا۔

" کیا نیت ہے آپ کی " چندر کلی بولی۔

" اری وہ تیرے جال سے نکلے تب تو میں اپنی نیت کی بات کروں۔" بلبیر کور نے کنکھیوں سے چندر کلی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

" اُسے بھیجوں آج " چندر کلی نے چٹکی لی۔

" اری - واہ تو سچ مان گئی — ویسے کیا وہ تیرا اتنا ہی کہا مانتا ہے۔"

" کیوں نہیں — میں تو روز اُسے چھجو کا حلیہ بتاتی ہوں — آپ بھی سردار۔"

" اچھا اب تو جا — سردار جی آنے والے ہیں — پھر بات کریں گے"

چندر کلی گھر لوٹی تو سوچ میں تھی۔ اس کے دماغ میں بلبیر کور کی باتوں نے عجب کھلبلی مچا دی تھی۔ کیا بلبیر کور میرے گھر آنے والوں پر نظر رکھتی ہے۔ کیا سچ مچ اس کی نیت — پھر اُسے یاد آیا کہ بلبیر کور جب اس کے جسم پر ہاتھ پھیرتی اسے کاٹتی اور جب وہ بلبیر کور کو دبوچ لیتی — اس کی تڑپ اس کی پھولی ہوئی سانسیں — کیا واقعی وہ اتنی ہی پیاسی ہے چندر کلی کو پھر وہ دن یاد آگیا جب چھجو اسے شادی کے بعد شہر لے آیا تھا۔ صبح جب وہ شہر پہنچے تو چھجو کو ڈیوٹی پر جانا تھا اور وہ اسے کھانے پینے کا ضروری سامان دینے کے بعد شام کو جلد لوٹ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا تھا اور سامنے ہی مکان میں ایک ارگنتا والا اپنی بیاہی بیوی سے — وہ کئی بار کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا ہٹا کر ادھر دیکھتی رہی تھی اور چھجو کے آنے کا انتظار کرتی رہی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر اس کا سانس پھول گیا تھا اور اپنی حالت معمول پر لانے کے لئے اسے کئی گلاس پانی کے پینے پڑے تھے۔ کئی بار اس نے ادھر نہ دیکھنے کی قسم کھائی تھی لیکن اس سے

رہا نہیں جاتا تھا۔

بہت انتظار کے بعد پانچ بجے تھے۔ کالونی کے دوسرے چپراسی دفتر سے لوٹنے شروع ہو گئے تھے اور پھر ساڑھے پانچ بج گئے۔ پھر چھ پھر ساڑھے چھ۔ چھجو کا انتظار کرتے کرتے اس کا جی رونے کو کر رہا تھا۔ اس کا جی چاہا تھا وہ بھاگ جائے پھر انہیں پہاڑیوں میں۔ انہیں جھرنوں کے پاس جہاں فضا کھلی کھلی ہو یا کم از کم ایسی گھٹن نہ ہو۔

اور جب رات کو چھجو نشے میں دُھت ایک دوست کے ساتھ گھر پہنچا تھا تو وہ محل جو اس نے صبح سے شام تک تعمیر کیا تھا دھرتی پر آ رہا۔ ٹھنڈا چولھا دیکھ کر چھجو آگ بگولا ہو گیا اور گالیاں دینے پر اتر آیا تھا۔ چندر کلی کا بھی جی چاہا تھا کہ وہ بھی زبان کھولے لیکن کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی۔ یہ حالت دیکھ کر چھجو کا دوست تو وہاں سے کھسک گیا اور کچھ دیر بعد چھجو نے چندر کلی سے معافی ہی مانگی۔ اس کی گود میں سر رکھ کر رو یا بھی اور پھر کہیں آدھی رات کے بعد چندر کلی کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ اس کے دماغ میں پھر وہ سب تصویریں گھومنے لگیں جنہیں وہ دن بھر سامنے کے کوارٹر میں دیکھتی رہی تھی اور جب چھجو نے اسے باہنوں میں لے کر اپنا منہ اس کے منہ کے پاس لانا چاہا تو اس کے منہ سے اٹھتی ہوئی بو کی وجہ سے چندر کلی نے اسے پرے دھکیل دیا اور اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔ چندر کلی حالانکہ چاہتی تھی کہ وہ اسے زور سے پکڑ لے۔ گرفت اور سخت کر لے اتنی سخت کہ وہ اس کی باہوں میں ڈھیلی پڑ جائے لیکن چھجو دھکیلے جانے کے بعد رو پڑا اور روتے روتے سو گیا

چھجو کا اب روز کا معمول تھا کہ وہ شراب پی کر گھر آتا اور گھر کے باہر ہی اپنے دوست کو وداع کرتے ہوئے کہتا "میرے دل میں اس کا ڈر بیٹھ گیا ہے۔ بڑی جابر عورت ہے۔

اس لئے میں بغیر پئے گھر میں نہیں گھس سکتا ۔ نشے کی حالت میں وہ اپنے آپ کو چھونے نہیں دیتی"

چندہ رکلی اب شام ہی کو کھانا تیار رکھتی کیونکہ فضول کی گالی گلوچ سے فائدہ بھی کیا تھا ۔ وہ اپنا دل مسوس کر رہ جاتی اس کے لئے حالات سے چھٹکارا پانے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا ۔ وہ دکھی دل سے کھانا بناتی ۔ خود بھی زہر مار کر لیتی اور چھجو کے آگے بھی ڈال دیتی ۔ اس نے کئی بار سوچا تھا کہ ایسی زندگی سے کیا فائدہ ۔ دو وقت کی روٹی تو اس کو اپنے باپ کے گھر میں مل ہی جاتی تھی ۔ پھر اسے اپنے باپ پر غصہ آتا لیکن وہ غصہ جلد ختم ہو جاتا ۔ اسے یاد تھا کہ اس کے باپ نے سب قرضہ اس کی ماں کی بیماری کے لئے لیا تھا ۔ اس کی ماں کو روز بخار ہو جاتا تھا ۔ اس کی ماں اسے بہت پیار کرتی تھی ۔ اس کی ماں نہیں رہی تھی تو اس کے باپ کے پاس بھی کچھ نہیں رہا تھا سوائے اس جھونپڑا نما مکان کے جس کی دہلیز پر بیٹھ کر وہ سارا سارا دن حقہ پیتا تھا اور اس شہزادے کی راہ دیکھا کرتا جو اس کی بیٹی کو بیاہنے آئے گا اور چھجو کو شہزادے کا نام دے کر وہ خود بخود ہنس رہی تھی ۔ اور پھر وہ سوچتے سوچتے سو گئی تھی ۔

دوسرے دن بلبیر کور کے ہاں پہنچی تو اس کا دل رات کی بات سوچ سوچ کر دھڑکنے لگا اور جب بلبیر کور نے اسے پیار سے اپنے پلنگ پر بٹھا لیا اور اس کا ہاتھ اس کی رانوں پر گدگدی کرنے لگا تو چندہ رکلی نے کہا "سردار جی نہیں ہیں کیا"

"وہ تو رات آئے ہی نہیں ۔ دورے پر گئے ہیں" بلبیر کور نے اس کی ران پر ناخن گاڑتے ہوئے کہا

"لیکن چھجو تو گیا نہیں"

"ہاں انہیں اچانک ہی جانا پڑا ۔ تار آیا تھا"

" بی بی جی" چندر کلی نے ہنس کر اور پرے ہٹتے ہوئے کہا " آپ ہاتھ کو بس میں رکھا کرو ۔ نہیں تو میرے بھی دو دو ہاتھ ہیں" چندر کلی نے چٹکی لیتے ہوئے کہا ۔

" اچھا ۔ چندر کلی تو کیا کہہ رہی تھی"

" مجھے تو یاد نہیں بی بی جی"

" تو بہت شیطان ہے ۔ تجھ سے پھر کہلائے گی"

" چلو یونہی سہی آپ پھر کہہ دیجئے"

" اچھا بتا ۔ تیری اس سے جان پہچان کیسے ہوئی اور پھر پہلی بار ۔" بلبیر کور آگے کچھ نہ کہہ سکی ۔ اس نے چندر کلی کو کندھوں سے پکڑ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں"

نہ جانے کیوں چندر کلی کی آنکھیں جب بلبیر کور کی آنکھوں سے چار ہو گئیں تو وہ بے بس ہو جاتی تھی جیسے کسی نے اس پر جادو کر دیا ہو ۔

" اچھا بتاتی ہوں بی بی جی ۔ سنو ایک روز وہ چھجو کو ڈھونڈتا ہوا دوپہر کو گھر آیا تھا ۔ چھجو دفتر سے کہیں گیا ہوا تھا اور جب میں نے اس سے پوچھا کہ چھجو سے کیا کام تھا تو اس نے کوئی ٹنڈر کا سا نام لیا تھا اور کہنے لگا کہ اس نے ابھی ابھی ٹھیکیدار کے ہاں نوکری کی تھی ۔ اگر اسے یہ کام مل جائے تو اس کی نوکری پکی ہو سکتی تھی ۔ اسے نوکری کی بہت سخت ضرورت تھی ۔ ٹھیکیدار نے چھجو کا نام لے کر کہا تھا کہ اگر وہ اسے خوش کر سکا تو صاحب میں ہمت نہیں کہ نہ کر سکیں ۔" بی بی جی میں وہ سجیلا نوجوان دیکھ کر ہی اپنے بس میں نہ رہی تھی ۔

بلبیر کور نے اس کو بازوؤں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے پھولی پھولی سانس میں کہا " پھر"

" یہ بی بی جی کیوں میرا ستیاناس کر رہی ہو "

" تو بتائے گی کہ نہیں " بلبیر کور نے چندر کلی کی ٹھوڑی اونچی کر کے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا۔

" میں نے اس سے کہا تھا ــ اگر تمہارا کام میں کروا دوں تو "

" آپ کو ہر طرح خوش کر دوں گا ــ مجھے نوکری کی بہت سخت ضرورت ہے " اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا تھا۔

" تو یہاں بیٹھو ــ اپنا نام بتا دو اور کام بھی اور جب تک میں نہ آؤں یہاں سے جانا نہیں "

" کیا نام ہے اس کا "

" انوپ ــ ہاں تو بی بی جی میرے دل میں ایک ڈر تو ضرور تھا ــ افسر تھے وہی سکسینہ صاحب۔ لیکن مجھ میں جیسے انوپ کو دیکھ کر کوئی پاگل پن جاگ اٹھا تھا۔ سکسینہ صاحب دوپہر کا کھانا کھانے گھر آئے ہوئے تھے۔ پائین باغ میں بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ میں پہنچی تو ذرا گھبرائے۔ میں نے ذرا ترچھی نظروں سے دیکھا تو ان کی گھبراہٹ اور بڑھی اور جب میں جھم سے ان کی کرسی کے پاس زمین پر بیٹھی تو ان کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ کبھی مجھے دیکھتے اور کبھی اپنے گھر کی طرف اور کبھی میرے کوارٹر کی طرف۔

" کیا کام ہے چندر کلی ــ جلدی کہو ــ چھجو کہاں ہے ــ تو ــ تو یہاں کیسے آ گئی ــ "

میں نے ذرا ان کے پاس کھسکتے ہوئے کہا " صاحب ایک ہمارا کام بھی کر دیجئے۔ چھجو کے کام تو آپ روز ہی کرتے ہیں "

" بول ۔ جلدی بول کیا کام ہے تیرا "

اور پھر میں نے بالکل ان کی کرسی کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ کر بہت پاس سے ان کی گھبراہٹ کو دیکھا۔ ان کی ناک کے نیچے پسینے کی بوندیں جھلک رہی تھیں۔ ان کی افسری کو بھی دیکھا جو جھاگ کی طرح بیٹھی جا رہی تھی۔ ان کی مردانگی کو بھی دیکھا جو دل کی دھڑکن بن کر اس کے سینے سے باہر نکلی پڑ رہی تھی۔ پھر جب میں نے آنکھوں میں مستی بھر کے اپنا کام بتایا تو ہلکی سی مسکان ان کے چہرے پر کھیل گئی۔

"مگر اس رات ـــ وہ آگے کچھ نہ کہہ سکے

"صاحب ہر بات کا کوئی ڈھب ہوتا ہے یونہی تھوڑی ـــ آخر میں بھی عورت ہوں۔ کوئی چوہیا تو ہوں نہیں کہ جب چاہا دبوچ لیا"

"مگر اس کے کام میں تجھے کیا دلچسپی" سکسینہ صاحب نے کہا۔

"پیسہ صاحب پیسہ"

"پیسہ تو ہم" ـــ

"نا صاحب نا۔ ہم حلال کی کھاتے ہیں

"اچھا تو اب جا۔ تیرا یہ کام ہو جائے گا۔ مگر ہمارا بھی خیال رکھا کر نہ ذرا چندر کلی"

"اور پھر بی بی جی میں نے گھر لوٹ کے اپنے کمرے کی کنڈی اندر سے لگا لی"

"پھر" بلبیر کور نے کہا۔

"بی بی جی۔ یہ آپ کا ہاتھ کیوں آپ کے بس میں نہیں رہتا۔ دیکھیے میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میرے بھی دو ہاتھ ہیں"

پھر پلنگ پر قہقہے بکھر گئے۔ دونوں کی سانسیں اکھڑ گئیں۔ چہرے سرخ ہو گئے اور اس طرح کی آوازیں کمرے میں گونجنے لگیں "اوئی ـــ سالی کاٹتی ہے ـــ اچھا ـــ پھر ـــ پھر میں بتاؤں ـــ سالی ہٹ جا، ورنہ پیٹ دوں گی"

" توبھیجوں بی بی جی اسے" چندر کلی نے بلبیر کور کی ران پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

" تو۔ چندر کلی ۔۔ یہ سب برداشت کر لے گی ۔" بلبیر کور نے کہا

" میری ایک ہی کہی بی بی جی ۔ آپ اپنی کہو ۔ بھیجوں کیا" چندر کلی نے کہا

نہیں نہیں پگلی ۔ یہاں نہیں ۔ کبھی تمہارے ہاں" بلبیر کور نے کہا۔

" پکی" چندر کلی نے کہا۔

" ہاں پکی ۔۔ مگر کسی کو ۔۔ اب جب سردار جی اور چھجو دورے پر جائیں گے نا۔"

" ٹھیک ۔۔ بی بی جی یہ اپنا ہاتھ تو ہٹاؤ ۔" چندر کلی نے اپنے بال سمیٹتے ہوئے کہا" بی بی جی اب آپ نے ہی یاد کروانا ہو گا ۔ میں تو اُس سے کل ہی بات کر لوں گی"

" تو بڑی بے شرم ہے ری"

"جی بی جی بھگوان کی قسم آپ کے لئے ڈر نہ ۔۔"

کچھ دن بعد سب کچھ طے ہو گیا تھا۔ سردار صاحب اور چھجو اگلے بدھوار جب تنگل دورے پر جائیں گے اسی رات چندر کلی کے کمرے میں بلبیر کور اد بلبیر کور کی کوٹھی میں چندر کلی کے سونے کا طے ہوا تھا۔ آخر بدھ کی صبح بھی آگئی۔ صبح سویرے سردار پریتم سنگھ کی کار میں چھجو بھی بیٹھ گیا تھا اور جب کار کوٹھی کے پھاٹک سے باہر نکلی تو چندر کلی بلبیر کور کے پاس آئی تھی اور دونوں کی آنکھوں میں شرارت بھری مستی جھوم رہی تھی ۔۔ دونوں چائے پینے بیٹھ گئیں ۔ بڑی دیر تک دونوں چپ رہیں ۔ بلبیر کور چاہتی تھی کہ چندر کلی کوئی بات چھیڑے اور چندر کلی کی خواہش تھی کہ بلبیر کور کچھ کہے ۔ آخر بلبیر کور بولی" چندر کلی مجھے تو ڈر لگتا ہے"

" چھوڑو نہ بی بی جی اب سب کچھ طے ہو گیا تو آپ کو ڈر لگنے لگا ہے" چندر کلی نے کہا

" چندر کلی تو اسے کسی طرح منع نہیں کر سکتی ۔۔ پرایا مرد ۔۔ چندر کلی ۔ تو نے

یہ کیا جھمیلا کھڑا کر دیا ہے" بلبیر کور بسورنے لگی ہے۔

" اچھا بی بی جی میں چلتی ہوں۔ آپ کے پاس بیٹھوں گی تو نہ جانے کون کون سی باتیں سوچ سوچ کر آپ پریشان کرتی رہیں گی مجھے"

سارا دن بلبیر کور چندر کلی کا انتظار کرتی رہی۔ دن پہاڑ سا لگ رہا تھا۔ سارا دن من ہی من میں بلبیر پلان بناتی رہی —۔ بار بار کھڑکی سے جاکر چندر کلی کے مکان کا محل وقوع دیکھتی رہی۔ ایک دو بار چندر کلی اپنے دروازے میں کھڑی دکھائی بھی دی۔ بلبیر کور نے اسے آنے کا اشارہ کیا۔ لیکن اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا دیں۔ بلبیر کور نے جب باہر جھانکا تو سورج دیوتا اس کی چھت پر ہی اٹک کر رہ گئے تھے۔ بڑی مشکل سے ہزار جتنوں سے سورج دیوتا پیچھے اور منہ پر اندھیرے کی چادر اوڑھ کر سو گئے تھے۔

جب چندر کلی نے بلبیر کور کے کمرے میں قدم رکھا تو وہ جھٹ سے بولی" تو تو بڑی کم ذات نکلی۔ سارا دن مجھے کڑاہی میں ڈال کر مزے سے سوتی رہی" بلبیر کور نے کہا" موئی دیکھ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے میرا دل اور زیادہ زور سے دھڑکنے لگا ہے۔ چندر کلی یہ بات کوئی اچھی نہیں کی تم نے"

" بی بی جی میرے آتے ہی آپ نے صبح والی باتیں پھر شروع کر دیں — میں چلتی ہوں" چندر کلی نے کہا۔

" اچھا بابا نہیں کرتی کوئی بات۔ لیکن ذرا تو میری چھاتی پر ہاتھ تو رکھ کر دیکھ" بلبیر کور نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی چھاتی پر رکھ دیا۔

" ہاں بی بی جی دھڑک تو رہا ہے ابھی" چندر کلی نے کہا۔

چندر کلی نے باہر نکل کر دیکھا — سردیوں کی رات — ہر طرف ایک گہرا سناٹا — گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ اُس نے بغیر کچھ بات کیے بلبیر کور کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنے

کوارٹر کی طرف لے گئی تھی۔ بلبیر کور نے ہزار ڈھنگ سے اپنے دل کی دھڑکنوں کو تیز ہونے ـــ سانس پھولنے اور اس غلط قدم کا احساس دلایا۔ لیکن چندر کلی نے اسے اپنے ایک کمرے کے کوارٹر میں دھکیل ہی دیا تھا" بی بی جی اندر سے کنڈی لگا لو ـــ وہ ٹھیک گیارہ بجے ـــ میں چلتی ہوں"

بلبیر کور کو اپنے کمرے میں چھوڑ کر چندر کلی بلبیر کور کی کوٹھی میں داخل ہوئی۔ اس نے سُکھ کا سانس لیا اور کچن میں جا کر پانی کا گلاس پیا اور بلبیر کور کے سونے والے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بار بار اٹھ کر گیٹ کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی کچن میں جا کر اپنے کمرے کی طرف جہاں سے اس کے کوارٹر کا دروازہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بلبیر کور کے بیڈ روم کی سب کھڑکیوں اور دروازوں کی کنڈیاں ٹھیک ڈھنگ سے لگائی تھیں۔ پھر وہ بلبیر کور کے نرم نرم بستر پر دراز ہو گئی تھی۔ جب دیوار پر لگے کلاک نے گیارہ بجائے تو اس کا دل بہت زور سے دھڑکنے لگا اور پھر اچانک ہی بجلی بند ہو گئی تھی۔ وہ بے چین سی ہو گئی اور پھر اچانک ہی باہر کا گیٹ کھلنے اور موٹر کے کوٹھی میں داخل ہونے کی آواز سُن کر اس کا دل بہت زور سے دھڑک اٹھا۔ اس نے بیڈ روم کا دروازہ کھولنا چاہا لیکن وہ باہر سے بند تھا۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگا کہ بلبیر کور نے اس کے ساتھ ہاتھ کر دیا تھا۔ وہ اس کی معصوم معصوم باتوں کے زہر کو بخوبی محسوس کرنے لگی تھی کیونکہ وہ سردار جی کی موٹر کی آواز خوب پہچانتی تھی۔ اس کی حالت بالکل اس سہمے ہوئے بکرے کی تھی جس کو ذبح کیا جانے والا ہو۔ اب اُسے ڈرائینگ روم میں کسی کے چلنے کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی لیکن اسے تھوڑا سا اطمینان تھا کہ ڈرائینگ روم میں کھلنے والے بیڈ روم کے دروازے کی کنڈی اس نے خود

لگائی تھی - اور پھر کسی نے دروازے کو دھکیلا اور کنڈی زمین پر گرنے کی آواز سے وہ بہت گھبرا گئی اور پھر — پھر — اس چنچل گھوڑی کی پیٹھ پر زین کس ہی دی گئی تھی -

اس کی سب ہوشیاری - چالاکی - حُسن کی رعونت - غرور سب کچھ خاک میں مل کر رہ گیا - اُسے بلبیر کور کی پیاسی پیاسی آنکھوں پیاسے ہونٹوں - پیاسی باتوں کا دھیان آیا — وہ کتنی چالاک عورت تھی - چندر کلی سے بھی زیادہ - جہاں بڑے بڑے گھاگ افسروں کی بھی نہ بن پڑی تھی وہاں وہ — بلبیر کور کے ہاتھوں ماری گئی — جو کام بڑے بڑے ہوس کے شاطر نہ کر سکے اس کو بلبیر کور نے چٹکیوں میں آسان بنا دیا تھا - وہ اس وقت اس بے بس ہرنی کی طرح تھی جو جال میں پھنس چکی تھی اور ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد کسی طرح چھٹکارے کی صورت نہ پا کر بے بس ہو کر دبک گئی تھی -

پھر صبح چار بجے جا کر کہیں بجلی آئی - سردار جی فاتحانہ انداز سے کھڑکی میں کھڑے داڑھی باندھ رہے تھے - چندر کلی اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی — وہ کھسیانی سی ہو کر اٹھی اور آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھول کر اپنے گھر کی طرف چل دی - لٹی لٹی سی - پریشان سی - جب اس نے پچھلے برآمدے میں قدم رکھا تو وہاں پھجو کھڑا تھا اور اسے دیکھتے ہی بولا "چندر کلی — چندر کلی — کسی بات کی تو چنتا نہ کر - میرا ماتھا اسی وقت ٹھنک گیا تھا جب سردار جی نے اپنی کار انبالہ میں روک کر کار کی خرابی کا بہانہ کر کے مجھے اتار دیا تھا اور کہا "پھجو تم ننگل پہنچو — میں — کار ٹھیک کروا کے کل پہنچ جاؤں گا" - مگر میں بس میں ہی لوٹ آیا تھا - تو فکر نہ کر چندر کلی — تو فکر نہ کر — میں سردار جی سے بھی نپٹ لوں گا - یہ بھی کیا یاد کریں گے - چل ذرا کوارٹر تو چل - چندر کلی غصے سے لال بھبھوکا ہو رہی تھی اور اپنے کوارٹر کی طرف جا رہی تھی — سردار جی اب بھی کھڑکی میں کھڑے اپنی داڑھی باندھ رہے تھے -

اور جب چھجو نے کوارٹر کا دروازہ کھولا۔ تو بلبیر کور اپنے ہاتھوں میں منہ چھپائے سسکیاں لے رہی تھی

چھجو بلند آواز سے سردار جی کو بلا رہا تھا۔ آؤ۔ سردار جی آؤ۔ بی بی جی یہاں ہیں۔ ادھر ہیں بی بی جی۔ آؤ نا۔ سردار جی۔

چھجو کی آواز سن کر سردار جی باہر آ گئے۔ انہوں نے ایک نظر چھجو کے کوارٹر کے کمرے کی طرف دیکھ کر چھجو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔" دیکھ چھجو میری عزت کا سوال ہے" سردار جی نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

چندرکلی سوچ رہی تھی کیا چھجو واقعی۔ چندرکلی کا دکھ اب آدھا بھی نہیں رہا تھا۔ سردار جی سر نیہوڑائے بلبیر کور کو کپڑے پہننے کے لئے کہہ رہے تھے۔ بلبیر کور کے دو بچے ابھی ابھی ماموں کی جیپ سے نکل کر کوٹھی میں گئے تھے۔ ٹھیکدار کا ملازم انوپ بند گراج کے روشندان میں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بلبیر کور سسکیاں لیتی ہوئی۔ بکھرے بالوں۔ سرخ سرخ روتی ہوئی آنکھیں جھکائے چھجو کے کوارٹر سے جب نکلی تو چھجو فاتحانہ انداز سے چندرکلی کا ہاتھ تھام کر کہہ رہا تھا" چندرکلی تو فکر نہ کر۔ یہ سالے افسر بھی کیا سمجھیں گے۔ ابھی تو سردار جی سے نپٹوں گا۔ میرا نام بھی چھجو ہے۔ چل چندرکلی چائے بنا۔ ٹھنڈ بہت ہے آج۔

سپنوں کی چوری

روما آج پھر لیٹ ہو گئی تھی۔ اس نے شام کو چار بجے آنے کا وعدہ کیا تھا اور اب چار بج کر پانچ منٹ ہو گئے تھے۔ وہ اس قدر لیٹ کبھی نہیں تھی لیکن انتظار کی گھڑیاں اور میں خود ہی اپنی اس بات پر مسکرا دیا۔ یہ جگہ کتنی رومانٹک ہے میں سوچنے لگا۔ یہ کلینک ہوتے ہوئے بھی کتنا پر سکون ہے یہ بھوت گھر لگتے ہوئے بھی کتنا دلکش ہے۔ مجھے یاد ہے جب پچھلے مہینے روما مجھے اپنے چچا کے اس کلینک میں لے کر آئی تھی تو اس کے چچا الفرڈ اس وقت کلینک میں نہیں تھے۔ روما نے وہ سب مشینیں اور اپریٹس دکھائے تھے جنہیں وہ خود چلا سکتی تھی۔ اس نے جب نیلے رنگ کی مدھم روشنی میں میرے نزدیک آکر میری آنکھوں میں جھانکا اور میں نے جب اپنے گالوں پر اس کے گرم سانسوں کی بھینی بھینی خوشبو کو محسوس کیا تو اس وقت روما کے جذبات اس کی آنکھوں سے امڈے پڑ رہے تھے۔ ہم ان ہیجان خیز لمحات میں ڈوبنا ہی چاہتے تھے کہ باہر سے اس کے چچا آ گئے تھے اور وہ روما روما پکار رہے تھے۔

ان کی آواز سن کر ہم باہر کے کمرے میں چلے آئے تھے۔ روما نے ان سے میرا تعارف کروایا لیکن وہ میری طرف دیکھے بغیر ہی اپنی کتاب کھول کر بیٹھ گئے ان کے ہاتھ میں شاید ٹیگور کی کتاب گیتانجلی تھی اور جب روما نے کہا "چچا جانی آپ مجھے پکار رہے تھے"

تو وہ بالکل انکار کر گئے اور مجھے الفرڈ صاحب کی شخصیت بہت عجیب سی لگی تھی۔

جب روما نے مجھے بعد میں بتایا تھا کہ اس کے چچا امریکہ سے نفسیات میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد یہاں اپنا نفسیاتی کلینک چلا رہے ہیں تو میں ان کی رکھائی اور بے توجہی کا سبب سمجھ گیا تھا لیکن بعد میں ان کی شخصیت عجیب تو تھی ہی دلچسپ بھی لگنے لگی تھی۔ شادی انہوں نے ابھی تک کی نہیں۔ کلینک سے انہیں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں۔ بکھرے بال عینک کے دبیز شیشوں میں سے خلا کو گھورتی ہوئی آنکھیں ہر وقت ہونٹوں میں پھنسی سگریٹ جہاں ان کی روکھی سوکھی زندگی کو اجاگر کرتی اور ان کے کلینک کی بے ترتیبی جہاں ان کی اپنی زندگی کی آئینہ دار ہے وہاں ان کا دھیما پن۔ ان کی گفتار کا نرم لہجہ اور فنونِ لطیفہ سے دلچسپی ــ ان سب باتوں نے مل کر انہیں پُراسرار سی شخصیت بنا رکھا ہے۔ شہر میں کوئی موسیقی کا پروگرام ہو یا شعر و شاعری کا ہنگامہ۔ کسی مصور کی تصویروں کی نمائش ہو یا محفلِ رقص الفرڈ صاحب اپنی تمام مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر وہاں پہنچ جاتے ہیں۔"

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی چار بج کر آٹھ منٹ ہوئے تھے میں حیران رہ گیا کہ پچھلے تین منٹ کے عرصے میں ہی میں نے کیا کچھ نہیں سوچ ڈالا آدمی کی فکر وقت سے کس قدر تیز ہے میں پھر الفرڈ صاحب کے کلینک کے بارے میں سوچنے لگا۔ پہلے پہل یہ کلینک تو مجھے بالکل بھوت گھر سا لگا تھا۔ کونوں کھدروں میں رکھے کتنے ہی گراموفون اور ان کے ریکارڈوں سے نکلتی ہوئی موسیقی اور چیخوں کی ڈراؤنی مخلوط آوازیں رنگ برنگی روشنیاں۔ بھیانک سے بھیانک شکلوں کے چارٹ لیکن اب یہ جگہ دل کو لبھانے والی تنہائیوں کو اپنی آغوش میں سمیٹے معلوم ہوتی ہے۔

روما کے دادا کا شہر میں بہت بڑا کاروبار ہے اور الفرڈ صاحب اسی بل بوتے پر اتنا بڑا کلینک کھولے بیٹھے ہیں بلکہ کہنا یہ چاہئے کہ انہوں نے ایک بہت

خوبصورت ٹھکانہ اپنا وقت کاٹنے کا بنا رکھا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ گزشتہ سال انہوں نے دو تین ایسے ذہنی مریض ٹھیک کر دیئے تھے جو ڈاکٹروں نے لا علاج قرار دے دیئے تھے۔ مریض تو اب بھی کئی آتے ہیں لیکن ان کی فیس سن کر یا ان کی عجیب و غریب شخصیت سے گھبرا کر لوٹ جاتے ہیں۔ دوسروں کی تو میں کیا کہوں وہ کچھ ہی ملاقاتوں میں مجھے تو بہت ہی اچھے لگنے لگے تھے اور اب ایک روز جب انہوں نے اچانک ہی بغیر کتاب سے آنکھیں اٹھائے کہا تھا "روما بہت پسند ہے تمہیں"

میں نے جواب تو کچھ نہیں دیا تھا بس ایک اپنائیت سی محسوس کی تھی ان کے اس سوال میں۔۔۔۔ روما اور میں اکثر اسی کلینک میں ملا کرتے ہیں۔ الفرڈ صاحب کلینک میں ہوں یا نہ ہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ روما کے پاس کلینک کی ایک چابی رہتی ہے۔

لیکن روما نہیں آئی۔ الفرڈ صاحب تو ضرور آج فرانس سے آئی تصویروں کی نمائش دیکھنے گئے ہوں گے جو پچھلے دو تین دنوں سے اخباروں میں چرچے کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے من میں سوچا۔ بادل گھر آئے تھے موسم بہت ہی سہانا ہو گیا تھا میں اٹھ کر کلینک میں ٹہلنے لگا۔ ڈرتے ڈرتے کچھ پراسرار روشنیاں جلائیں بجھائیں لیکن اس ڈر سے مبادا کچھ سلسلہ بگڑ جائے میں کرسی پر آ بیٹھا جس پر الفرڈ صاحب بیٹھ کر دنیا بھر کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے ہیں۔ اور کوئی مریض بھولے سے اس دوران میں آ جائے تو جھلا اٹھتے ہیں۔ میں کرسی پر بیٹھا تو عقب سے ایک بلب خود بخود روشن ہو اٹھا۔ میں نے لمبی سانس لے کر گھڑی دیکھی جو آج بہت ہی سست رفتار سے چل رہی تھی۔ میں نے الفرڈ صاحب کی کتابیں دیکھنا شروع کیں لیکن من نہیں لگا۔

میز کے اوپر ایک فائل رکھی تھی اور فائل کے اوپر ایک خط رکھا تھا روما

کے نام ۔ کئی بار جی چاہا کہ خط کھول کر پڑھ لوں لیکن وضعداری آڑے آگئی ۔ میں نے خط جیب میں ڈال لیا اور فائل اٹھالی ۔ یہ شاید کوئی کیس ہسٹری تھی ۔ ایک عورت کی تصویر اس فائل کے ساتھ نتھی کی ہوئی تھی ۔ میں تصویر دیکھ کر چونکا وہ تصویر میری ماں کی تھی اور اس تصویر کے ساتھ ایک خط بھی تھا جو میری ماں نے الفرڈ صاحب کو لکھا تھا ۔ میں بے تابی سے وہ خط پڑھنے لگا :۔

جناب الفرڈ صاحب

آپ کے کہنے کے مطابق میں اپنی کیس ہسٹری بھیج رہی ہوں ۔ میں نے کوئی واقعہ چھپانے کی کوشش نہیں کی ۔ اپنی کوئی بھی اچھی بری عادت لکھنے سے گریز نہیں کیا ۔ میں شاعرہ ہوں یہ تو میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں ۔ میں دو بچوں کی ماں بھی ہوں لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں ان کی ماں نہیں ہوں ۔ میری ممتا کا دریا سوکھ چکا ہے ۔ بچے مجھ سے ماں کا پیار چاہتے ہیں جو شاید اب مجھ میں نہیں رہا ۔ اس کے علاوہ میں ایک باحیثیت آدمی کی بیوی بھی ہوں جو بہت وضعدار اور سمجھ دار ہونے کے ساتھ ایک مرد بھی ہے ۔ اسے میرے اندر کی عورت چاہیئے جو اسے اب مل نہیں پاتی ۔ انتہائی مایوسی میں وہ شراب کا سہارا لیتا ہے ۔ مجھ سے اس کا یہ کرب دیکھا نہیں جاتا لیکن میں اپنے آپ کو کسی طرح بھی نہیں سلگا پاتی ۔ میری نسوانی تپش جیسے ختم ہو چکی ہے ۔

اس نے پچھلے برس ہی میری شاعری کی کتاب بہت پیار اور بہت سے روپے خرچ کر کے چھپوائی تھی ۔ مجھے اس کا علم اس وقت ہوا جب ایک رات کو اس نے مجھے سینے سے لگا کر اس کتاب کی

ایک جلد میرے ہاتھ میں تھمائی تھی۔ لیکن میرے ہاتھوں میں میری نظموں کی کتاب جیسے شعلہ بن کر دہکنے لگی تھی۔ میں نے اسے کھولے بغیر اپنے سرہانے کے نیچے رکھ دیا تھا اور محض ایک بیوی کے فرض کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کی باہنوں میں ڈھیلی پڑ گئی تھی اور نہ میری اس حرکت سے اور پریشان ہو گیا تھا۔ پریشانی میں وہ اکثر شراب پینے لگتا ہے۔ اس نے بڑے پیار سے میرا جسم بستر پر ڈال دیا اور شراب پینے لگا تھا۔ میں یہ سب جان کر بھی ابھی تک ایک برف کی سِل ہوں اور بچوں اور خاوند کی خاطر محبت سے پگھلنا چاہتی ہوں۔

میں اپنی زندگی کے واقعات جو میرے ذہن میں محفوظ ہیں لکھ رہی ہوں۔ آپ کی مہربانی ہوگی اگر آپ ان کا تجزیہ فرمائیں۔ اور جس وقت آپ ذاتی پوچھ تاچھ کے لئے بلائیں گے میں حاضر ہو جاؤں گی

آپ کی مریضہ

رچنا۔

خط پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں کئی واقعات ابھر آئے جب میں نے اپنی ماں کو اپنے، اپنی چھوٹی بہن اور ڈیڈی کے تئیں اتنا ہی ٹھنڈا پایا تھا جو اس نے خط میں لکھا تھا۔ اب اس کی آنکھوں کی بے بسی مجھے صاف صاف نظر آ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے کپکپاتے ہونٹ، اس کی کھلی کھلی حیران آنکھیں کہنا تو بہت کچھ چاہتی تھیں لیکن ــــ اس کا ہر ایک جذبہ جو منجمد ہو چکا تھا جسے وہ پیار کی آنچ سے پگھلانا چاہتی تھی ــــ تبھی ــــ تبھی تو ــــ میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔

میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی اس کیس ہسٹری کو پڑھنے کے لئے ــ کن حالات

نے میری ماں کو میری ماں نہیں رہنے دیا تھا۔ جس کی مسکان مسکان نہیں زہر خند بن کے رہ گئی تھی۔ میں نے کیس پڑھنے کے لئے فائل کے ورق الٹے۔ الفرڈ صاحب یہ کیس ہسٹری دیکھ چکے تھے کیونکہ اہم واقعات پر لال رنگ سے دائرے بنے ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے انہوں نے اس کیس کا بغور مطالعہ کیا تھا کیونکہ حاشیوں میں نفسیاتی TERMINOLOGY میں بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ "اسے کاش روما نہ ہی آئے تو اچھا ہے" میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ پھر میں نے خط کشیدہ اور لال دائروں والے واقعات پڑھنے شروع کئے "میرے سپنے بچپن ہی سے چوری ہو جاتے رہے۔ سپنے سارے سپنے جو میں نے دن کو جاگتے میں دیکھے تھے یا رات کو سوتے میں۔ میرا سب سے پہلا سپنا جو چوری ہوا وہ ہمارے گھر کے آنگن میں بندھی ایک بہت ہی خوب صورت گائے کا تھا جس نے بارہا پیار سے میرے ہاتھوں کو اپنی زبان سے چاٹا تھا جس کے تھنوں سے دودھ کی دھار میرے چہرے پر امرت بن کر پڑتی تھی اور میں اپنی زبان سے ان چھینٹوں کو چاٹنے میں ایک عجیب لذت محسوس کرتی تھی پر ایک دن وہ گائے چوری ہو گئی ۔۔۔ مجھے یاد ہے میں کئی دنوں تک اسے یاد کر کر کے روتی رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ میرا سپنا بھی چوری ہو گیا۔

دوسرا سپنا جو میں اکثر دیکھا کرتی تھی وہ میری ماں کی شفقت بھری گود کا تھا۔ میں دیکھتی کہ سکول کی بوجھل فضا سے تھکی ہاری گھر لوٹ رہی ہوں۔ آنگن سے باہر ہی میری ماں مجھے اپنی گود میں لے لیتی ہے۔ انتہائی پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے۔ کبھی ماتھا چومتی ہے تو کبھی گال اور میں اس کی گود سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتی ہوں کیونکہ باہر میری سہیلیاں دودھ پی کر کھیلنے کے لئے آ چکی ہیں۔ کھیلنا کودنا شاید ماں کے پیار سے بھی ۔۔۔ میں ابھی دس ہی برس کی تھی کہ میری ماں اچانک جل کر مر گئی اور میرا سپنا چور چور ہو گیا۔

ماں کے مرنے کے بعد میری دادی میرے سپنوں کی رانی بن گئی۔ پو پھٹے منہ سے وہ مجھے ان پریوں کے دیس کی کہانیاں سناتی جسے میں آج تک ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ وہ مجھے اپنے مرجھائے ہوئے جسم سے اس طرح چپٹا لیتی کہ اس کے مرجھا ہوئے جسم کا لمس اب تک میرے ذہن سے جدا نہیں ہوا۔ ہر توانا جسم چاہے وہ میرے خاوند کا ہو یا میرے جوان بیٹے کا نرم نرم سا لگتا ہے اور پھر ایک دن میری دادی بھی چل بسی۔ ان دنوں میں گیارہ سال کی تھی۔

اس کے بعد کا سپنا جو میں نے دیکھا تھا وہ میرے گھر کا میرے لڑکپن کا میرے سکول کا میرے گھر کے آنگن میں گھنی چھاؤں کا تھا نیم کے پیڑ۔ کھلا کھلا آنگن۔ گھر کے پاس سے گزرتی ہوئی نہر۔ کوئل کی کوک۔ آموں کے جھنڈ۔ چرواہوں کی مدھ بھری بانسری کی لے۔ رہٹ چلنے کی رُوں رُوں۔ چرخے کی گھوں گھوں۔ چکی کی صدا۔ چھاچھ کے بھرے کٹورے۔ پیلی پیلی سوندھی سوندھی خوشبو والی مکئی کی روٹیاں۔ بگلوں کی طرح اجلا اجلا مکھن۔ دھول سے اٹے کھلنڈرے لڑکے لڑکیوں کے چہرے۔ چوپال پر کھاٹ پر بیٹھے مولوی رمضان کی براک داڑھی۔ ٹوٹی پھوٹی مسجد سے آتی ہوئی مؤذن کی دل لبھانے والی آواز۔ مندر کی گھنٹیاں۔ گلی میں لوز ائیدہ پلّوں کی چوں چوں۔ سردی میں ٹھٹھرے ہوئے چوکیدار کی آواز۔ سکول میں کشیدہ کاری سکھانے والی لاجونتی کا دمکتا ہوا چہرہ اور سفید دھوتی۔ سکول کی بیوہ مائی کی بھری بھری آنکھیں۔ جمیلہ اور اقبال کی دوستی اور جھگڑے۔ یہ سپنا اس وقت ٹوٹا جب ملک کا بٹوارہ ہو گیا۔ اور ہمیں اپنا قصبہ چھوڑ کر ہندوستان کے ایک شہر میں رہنا پڑا اور جب ہم ایک دور کے رشتہ دار کے ہاں پناہ گزین ہوئے۔ وہ رشتے میں میرے چچا لگتے تھے۔ بہت سجن پرش۔ صبح سویرے اٹھ کر گھنٹوں گھر میں بنائے مندر میں پوجا پاٹ کرتے تھے۔ پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر اپنی بیٹھک

میں بیٹھ جاتے جہاں محلے بھر کے لوگ جمع ہوتے ۔ شہر سے مسلمانوں کو دھمکانے ۔ بھگانے لوٹنے اور مارنے کے منصوبے بنائے جاتے ۔ تجوری میں سے میرے چچا جہاں لوگوں کو ۔ نوٹ نکال کر دیتے وہاں سے پستول ، بم بھی ساتھ دیتے ۔ پھر علاقے کے علاقے مسلمانوں سے خالی ہونا شروع ہو گئے ۔ لوٹ کا مال گاڑیوں میں بھر بھر کر ہمارے رشتہ دار کے ہاں جمع ہوتا ۔ اپنی ضرورت اور پسند کا مال وہ رکھ لیتے باقی کا محلے بھر میں بٹ جاتا ۔ میں ، میرا بڑا بھائی اور پتاجی ایک مسلمان کے مکان میں گھس گئے ۔ جو میرے چچا کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا اور جس کا طوطے کا خالی پنجرہ تک ان کے ہاں پہنچ چکا تھا ۔ محلے بھر میں گلی سڑی لاشوں کی بدبو جیسے انسانیت سے سڑا ضندھ اٹھ رہی ہو ۔ میں ان دنوں بہت سہمی سہمی رہتی اور مجھے یقین تھا کہ جیسے ہمارے قصبے میں جب شیر خان نے کالے خان کو قتل کر دیا تھا اور شیر خان کو پھانسی لگ گئی تھی اسی طرح میرے چچا اور اس کے ساتھیوں کو بھی ایک نہ ایک دن ضرور پھانسی لگے گی جو اتنے مسلمانوں کا خون بہا چکے تھے ۔ کسی نہ کسی دن جب ہماری سرکار کے پاؤں مضبوط ہو جائیں گے یہ سب ضرور پھانسی لگیں گے ۔ یہ بات اب تک میرے ذہن سے نہیں نکلی ۔ میرے چچا پھر ایک بڑی مل کے مالک بن گئے ۔ وہ اب بھی دندناتے پھرتے ہیں ۔ میرے دماغ میں یہ بھیانک سپنا کہ ان سب قاتلوں کو پھانسی لگنی چاہیئے بہت دیر تک پنپتا رہا اور بیس سال کے بعد یہ سپنا اس وقت چور چور ہو گیا جب میرے رشتے کے چچا ایم ایل اے بن گئے اور وزیر بننے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگے ۔

میرے باپو کو پاکستان میں چھوڑی ہوئی زمینوں کے عوض بہت سی زمین اور ایک مکان الاٹ ہو گیا ۔ میرے دماغ سے پھر کھیتوں کو لہلہاتا دیکھنے کا سپنا اس وقت ٹوٹ گیا جب باپو نے اپنی ساری زمین بیچ کر میرے چچا کے مشورے سے ایک فیکٹری

لگالی۔ چوڑے چکلے سینے والے باپو کے چہرے پر جھریاں جال بننے لگی تھیں اور اس کی خوش مزاجی میں چڑچڑا پن آنے لگا تھا۔ بات بات پر وہ میرے بھائی پر جھلّانے لگا تھا۔ کئی کئی دن باپو گھر نہیں لوٹتا تھا۔ اکثر شراب کے نشے میں وحشت رہتا۔ مجھے دیکھ کر نظریں نیچی کر لیتا اور اگر میں سامنے آ ہی جاتی تو جلدی جلدی کسی بہانے دُور جانے کی کوشش کرتا اور میرے بھائی نے بتلایا تھا کہ اُس نے کئی بار باپو کو ہوٹلوں میں آوارہ عورتوں ـــــ۔

پھر میرا بھیا میرے سپنوں کا راجہ بن گیا۔ وہ مجھے بہت پیار کرتا تھا۔ مجھے کالج چھوڑنے جاتا اور کالج سے لینے بھی۔ اس نے مجھے کبھی اکیلاپن محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔ سارا سارا دن اپنے کمرے میں گم سم کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ میں نے کئی بار اس کی غیر حاضری میں اس کے کمرے میں لینن۔ سٹالن اور ماؤزے تنگ کی تصویریں ٹنگی دیکھی تھیں جو میرا باپو اکثر پھاڑ پھاڑ کر پھینک دیتا تھا۔ باپو میرے بھیا کو بہت ڈانٹتا تھا۔ میرا بھائی یہ سب کچھ سنتا رہتا۔ مسکراتا رہتا کانٹوں بھری ڈالی پر لگے پھول کی طرح

ایک روز میرا یہ سپنا بھی ٹوٹ گیا۔ میرے بھائی کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔ سُنا تھا وہ نکسلائٹ ـ میں بہت روئی تھی بہت چلائی تھی لیکن اتنے بڑے مکان میں میرے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔ روتے روتے میری آنکھیں سوج گئی تھیں۔ جب میرا باپو گھر لوٹا وہ بھی غمگین تھا۔ مجھے بہت دیر تک چپ کراتا رہا تھا۔ برسوں کے بعد اس میں وہ شفقت جاگ اٹھی تھی جس کے لئے میں ترس کے رہ گئی تھی۔ اس کے بعد باپو نے گھر پر ہی رہنا شروع کر دیا تھا۔ شراب پینا چھوڑ دیا تھا۔ ہوٹلوں میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ فیکٹری بے دلی سے چلا رہا تھا۔ میرے رشتے کے چچا سے مل کر سرکار سے میر بھیا کو چھڑوانے کی کوشش بھی بہت کی اُس نے لیکن بھیا

معافی مانگنے کو تیار نہیں تھا اور سرکار اسے چھوڑنے کو راضی نہیں تھی۔

کالج میں میری ملاقات انور سے ہوئی۔ وہ بہت اچھے ڈرامے لکھتا تھا اور اس سال کالج میں کھیلے جانے والا ڈرامہ اسی کا لکھا ہوا تھا۔ میں اس ڈرامے میں بطور ہیروئن چُن لی گئی تھی۔ باپو نے بے دلی سے مجھے اجازت بھی دے دی تھی اور رات کو ریہرسل کے بعد مجھے کار میں لینے بھی آجاتا تھا۔ جیسے جیسے انور کی شخصیت مجھے جکڑے جا رہی تھی ویسے ویسے باپو اپنی غلطی پر پشیمان ہو رہا تھا۔

انور جب ڈرامے کے موضوع پر گفتگو کرتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ بہت بڑا ڈرامہ نویس بنے گا۔ اس کے خدوخال۔ گورا چٹا رنگ بڑی بڑی مست آنکھیں جنھیں دیکھ کر میں اپنے بس میں نہ رہتی تھی۔ پھر ایک دن رات کو ریہرسل سے لوٹتے وقت میں نے حوصلے سے کام لے کر باپو سے کہہ ہی دیا "انور مجھے بہت پسند ہے" باپو کچھ نہیں بولا تھا اور میرے اصرار کرنے پر اس نے کہا "مجھے سوچنے کا موقعہ دو رچنا"

اور پھر جس رات ڈرامہ سٹیج ہونا تھا انور کا قتل ہو گیا۔ جب میرا یہ سپنا ٹوٹا تو میں خود ٹوٹ کر رہ گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی میرے خوابوں اور وجود کے ٹکڑے میری شاعری میں ڈھل گئے۔ میرے باپو کو دل کا دورہ پڑا۔ اس نے فیکٹری بیچ دی اور اسی حالت میں تین سال بیت گئے۔ ایک رات اچانک ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے نحیف اور کمزور بھیا بڑھی ہوئی داڑھی کے ساتھ دروازے میں کھڑا تھا۔ میں نے اسے اس کی آنکھوں سے پہچانا تھا جو اب بھی اسی طرح بے چینی سے ادھر ادھر کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ میں اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ ہم ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر یوں رو رہے تھے جیسے صدیوں کے دُکھ درد کی میل دھونے پر تلے ہوں۔ اور اسی رات باپو ہمیں چھوڑ کر پرلوک سدھار

گیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد ہمارے دل کی حالت سنبھلی اور جب بھیا نے میرے لکھے ہوئے کاغذات دیکھے۔ پڑھے تو ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیلتی چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک انگڑائیاں لینے لگی۔ "اری رچنا تو تو شاعر بن گئی" بھیا نے بہت پیار سے میری پیشانی کو چوم کر کہا تھا۔ روما اچانک اندر داخل ہوئی۔ میں نے فوراً فائل بند کر دی۔ میرے ذہن میں عجیب سا تناؤ تھا۔ ایک گھٹن تھی۔ میں کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن سوچ نہیں پا رہا تھا۔ جیسے میرے سوچنے کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ میں اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ میں روما کا خیر مقدم کرنا بھی بھول گیا۔

"بڑی دیر کر دی" میں نے سرد مہری سے روما سے کہا۔

ابھی پانچ بجے ہیں صاحب اور تم کہتے ہو دیر کر دی جب کہ تم نے ملنے کا وقت چھ بجے کا دیا تھا۔ میں تو یونہی جلدی آ گئی سوچا کہ تم میں صبر والی کوئی چیز تو ہے نہیں۔ تم ضرور یہیں ہو گے۔ میں نے روما کو اس کے چچا کا خط دیا جو وہ روما کے نام میز پر چھوڑ گئے تھے۔ وہ خط پڑھنے لگی میں سوچنے لگا۔ جس شخص کا ایک ایک سپنا ٹوٹ چکا ہو۔ چوری چلا گیا ہو۔ چور چور ہو گیا ہو وہ — اب بھی زندہ ہے — اور میری ماں نے جب روما سے میری ملاقات کروائی تھی تو یہی کہا تھا دیکھو روما میرے سپنوں کی بہو ہے — روما نے خط پڑھ کر میرے ہاتھ میں تھما دیا — میں نے پڑھا :—

پیاری روما

میرا ایک کام کرنا۔ اس فائل کو جو اس خط کے نیچے رکھی ہے رچنا دیوی کو واپس بھیج دینا انہیں کہہ دینا کہ میں ان کے چوری شدہ سپنے تو انہیں نہیں دلوا سکتا

اور نہ ہی ان کے ٹوٹے ہوئے سپنے جوڑ سکتا ہوں۔ میں نے ان کی نظموں کی کتاب بازار سے خرید کر پڑھی ہے۔ مجھے ان کے خاوند اور بچوں سے پوری پوری ہمدردی بھی ہے۔ لیکن میں اپنی رائے یہ سمجھتا ہوں کہ ان کو شاعری کرتے رہنا چاہیئے۔ اس میں سارے جہان کے لوگوں کا درد ہے کرب ہے۔ میں ان میں سوئی ہوئی ممتا کو نسائیت کو جگا تو سکتا ہوں اور بچوں کو ان کی ماں اور ان کے خاوند کو بیوی تو مل جائے گی ـــ لیکن ـــ لیکن ـــ ردما تم یہ فائل ان کو واپس ہی کر دو

تمہارا چچا

"الفرڈ"

دوسرا زخم

ہریش کاؤسس جی ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ آج اس کا دماغ سوچوں سے خالی تھا۔ وہ دراصل کچھ سوچنا چاہتا بھی نہیں تھا۔ سوچ کسی الجھن کا حل تو ہے نہیں۔ پچھلے بیس پچیس دنوں میں اس نے کیا کچھ نہیں سوچا تھا لیکن اس کی سوچ سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ بھی تو نہیں نکلا۔ آخر وہ سوچ ہی تو تھی جو اسے جالندھر سے بمبئی لے آئی تھی اور بمبئی میں نوکری کے لئے در بدر بھٹکاتی پھر رہی تھی۔ وہ سوچ جس نے اسے گھر سے اپنی سوتیلی ماں، اپنے سوتیلے بہن بھائیوں سے اپنے دوستوں سے اپنے شہر سے یہاں لا پھینکا تھا۔ ماں بدچلن تھی لیکن وہ بے چاری کیا کرتی۔ جہاں وہ ماں کی بدچلنی سے تنگ آکر گھر سے بھاگ آیا تھا۔ وہاں اسے اس سے پوری پوری ہمدردی بھی تھی۔ اسے غصہ تھا تو اپنے باپ پر جس نے اپنے بڑھاپے میں ایک جوان لڑکی کو خرید کر اپنے گھر میں ڈال لیا تھا۔ اور جلدی سے دو بچے شاید اس لئے پیدا کر دیئے تھے مبادا وہ جوان لڑکی بھاگ جائے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کے باپ نے یہ قدم اٹھا کر کچھ اچھا نہیں کیا تھا۔ اس کا باپ آڑھت کی دکان پر منیم تھا اور ماں کی طویل بیماری نے اسے انتہائی تنگ دستی کے دروازے پر لاکر کھڑا کر دیا تھا۔ اور پھر وہ کینسر سے مر گئی تھی اور اسے پتہ نہیں کیا سوجھی کہ اس نے دوسری شادی کر لی۔

محلّے والے اس کی اس حرکت پر ناخوش تھے۔ رشتے دار بھی ناراض ہو گئے تھے اور خود ہریش کئی دن گھر نہیں آیا تھا کسی دوست کے ہاں پڑا رہا تھا۔ وہ تو خیر کچھ دنوں بعد گھر لوٹ بھی آیا تھا لیکن گھر کا سکھ چین گھر کی شانتی جو ایک بار گھر سے نکلے تو لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ اسے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ اس کا باپ یہ قدم اٹھا کر پچھتایا تھا کہ نہیں لیکن کچھ ہی دنوں میں مرجھا ضرور گیا تھا اور پھر دو سال بعد دو ننھے بچوں کو روتے چھوڑ کر بھگوان کو پیارا ہو گیا تھا۔

وہ ان دنوں دسویں جماعت میں تھا جب گھر کا سارا بوجھ اس کی سوتیلی ماں کے کندھوں پر آپڑا تھا۔ وہ جس طرح اسے غصے بھری نظروں سے دیکھتی تھی اپنے بچوں کو بھی ویسی ہی قہر آلود نگاہوں سے تکا کرتی تھی۔ وہ تو خیر حالات کی نزاکت کو سمجھتا۔ لیکن وہ معصوم سارا دن پیٹتے اور چلاتے رہتے تھے۔ گھر میں کہرام مچا رہتا۔ آہستہ آہستہ گھر کے کپڑے۔ لتّے۔ برتن۔ لکڑی کے صندوق۔ ٹوٹی پھوٹی کرسیاں سب کچھ بک گئے تھے اور چولہا ٹھنڈا پڑا رہنے لگا۔

آخر ایک دن بہت منّت سماجت کے بعد آڑھت کی دوکان کے مالک نے رحم کھا کر اسے چالیس روپے ماہوار پر اپنی دکان پر ملازم رکھ لیا تھا اور اس کی پڑھائی بھی چھوٹ گئی تھی۔ لیکن چالیس روپے سے کیا ہوتا۔ تو بھی ایک مہینے کے بعد جب اس نے چالیس روپے لا کر ماں کے ہاتھ پر رکھے تو اس کی کھوئی ہوئی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر لوٹ آئی تھی اور پہلی بار اس کو پیار بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ ان روپوں سے گھر میں ہفتہ بھر تو رونق سی رہی تھی۔ بچے بھی کچھ کم لڑتے تھے۔ لیکن ایک ہفتہ گزرنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ سات ہی دن تو ہوتے ہیں ایک ہفتہ میں اس کے بعد پھر وہی شور و غوغا وہی مار پیٹ۔ پھر آخر ایک دن وہی ہوا جس کا محلّے کے کچھ لوگوں کو انتظار تھا۔ ماں سے بچوں کی بھوک برداشت

نہ ہوسکی تھی جوان بیوہ اور اس کی تنگدستی نے ہوس کاروں کا راستہ ہموار کر دیا تھا۔
ہریش کو یاد آیا جب وہ ایک شام کام سے لوٹا تھا تو اس کی ماں نے گھٹیا سا پوڈر لگایا ہوا تھا منہ پر اور بالوں کو سنوارتے ہوئے اس نے ہریش کو کہا تھا کہ وہ بچوں کا خیال رکھے وہ تھوڑی دیر میں لوٹ آئے گی۔ مگر وہ رات بھر نہیں لوٹی تھی۔ بچے ساری رات بھوک سے بلکتے رہے تھے اور پڑوسی بار بار اٹھ کر اسے ڈانٹتے رہے تھے۔ "کہاں مرگئی ہے ان کی ماں۔ چپ کراؤ کم بختوں کو۔ سونے بھی نہیں دیتے۔ بھوک کی وجہ سے۔ بچے اس کے سنبھالنے پر بھی نہیں سنبھل رہے تھے۔ اس کا اپنا جی چاہا تھا کہ بچوں کو اٹھا کر گلی میں پھینک دے خود اس کی اپنی آنکھیں نیند کے بوجھ سے پھٹی جارہی تھیں اور اسے اپنی ماں پر بھی غصہ آرہا تھا جو اب تک نہ لوٹی تھی اور اسے اس کا کچھ پتہ بھی نہیں تھا۔ اس نے کئی بار اٹھ کر باہر گلی میں جھانکا تھا مگر وہاں سناٹے کے سوا دور تک کچھ بھی نہ تھا۔ تین بجے کہیں جاکر بچے بلک بلک کر سوئے تھے۔ شاید پڑوسی بھی سو گئے تھے کیوں کہ اس کے کانوں تک اب گالیوں کی آواز نہیں آرہی تھی۔ اور پھر۔ پھر اسے بھی نہ جانے کب نیند آگئی تھی۔ صبح پانچ بجے جب دروازے پر دستک ہوئی تو اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اندر آکر اس کی ماں اپنے بچوں سے لپٹ گئی تھی اور پہروں روتی رہی تھی اس کے دل میں کئی بار آیا کہ وہ اپنی ماں سے پوچھے کہ وہ رات بھر کہاں رہی تھی لیکن وہ کچھ بھی نہ پوچھ سکا تھا۔

صبح چولھا بھی گرم ہوا تھا۔ بچوں کے لئے دودھ بھی آیا تھا۔ ماں نے اس کے لئے پراٹھے بھی بنائے تھے۔ لیکن جب وہ گھر سے نکلا تھا تو اس نے دیکھا کہ محلّے والے گلی میں ٹولیاں بنائے کھڑے تھے اور سبھی اس کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے اس کے سر پر سینگ اُگ آئے ہوں اور سامنے کے گھر والے جگدیش نے جو باہر کھڑا ابھی تک داتن کر رہا تھا اس سے کہہ ہی دیا تھا "تیری ماں کہاں تھی رات بھر۔

سالے بچوں نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ سو نے بھی نہیں دیا" اور باقی سبھی لوگ قہقہہ مار کر ہنس دیئے تھے۔ اسے خود سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس کی ماں رات بھر رہی کہاں

اس کے بعد یہ اس کا معمول بن گیا تھا لیکن اب اسے بچوں کو سنبھالنے میں دقت نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں دودھ کا ڈبہ بھی رہتا تھا اور تھرموس میں گرم پانی بھی اس کے علاوہ بستر پر چادر بھی بچھ گئی تھی اور سردی سے بچنے کو ایک لحاف بھی تھا۔

اب اس کی ماں کا رنگ روپ بھی نکھرنے لگا تھا۔ گھر میں آٹا۔ دال۔ گھی سب کچھ موجود رہتا تھا۔ محلے میں چہ میگوئیاں تو اب بھی ہوتی تھیں لیکن دبی زبان میں کسی کو بولنے کی جراُت نہیں ہوتی تھی کیونکہ سب کو پتہ چل گیا تھا کہ اس کی ماں ایم۔ایل۔اے صاحب کے گھر کام کرنے جاتی تھی۔ تین سال کے اندر گھر کا نقشہ بدل گیا تھا۔ بچے کتنے موٹے موٹے اور خوبصورت لگنے لگے تھے۔ گھر میں ریڈیو، صوفہ سیٹ اور بجلی کا پنکھا بھی آگئے تھے۔ فرش پر دری بچھ گئی تھی دروازوں پر پردے بھی لٹکنے لگے تھے اور اب تو اس کی ماں کبھی کبھی گنگنایا بھی کرتی تھی۔ گھر میں بڑھتی ہوئی رونق کے ساتھ ساتھ اس کے دماغ میں بھی کئی باتیں دریچوں کی طرح کھلتی جارہی تھیں۔ لیکن جب ایم۔ایل۔اے صاحب کا جیپ کے حادثے میں انتقال ہو گیا تو گھر میں پھر مُردنی سی چھانے لگی تھی لیکن اس کی ماں کو اب گھر چلانا آگیا تھا۔ وہ بھی اب کچھ بھانپنے اور سمجھنے لگا تھا۔ محلّے والوں کے بند منہ پھر کھلنے لگے تھے لیکن اب اس کی ماں حالات سے جھوجھنا سیکھ گئی تھی۔ کسی نے آوازہ کسا نہیں کہ وہ شیرنی کی طرح گرجی نہیں۔ اس طرح ان کے خلاف حقارت کی آگ سلگنے لگی۔ گھر گھر چرچے ہوئے۔ محلّے بھر کے شریف آدمیوں کی مندر میں میٹنگیں بھی ہوئیں اور محلّے والوں کا ان کے گھر سے میل جول بند ہو گیا تھا۔ محلّے بھر کے بچے اس کے

چھوٹے بہن بھائی سے کنی کترانے لگے تھے۔ لیکن اس کی ماں شیرنی کی طرح ڈٹی رہی۔ یہ سب کچھ اب اسے اکھرنے لگا تھا۔ اس میں لوگوں کے طعنے سننے کی ہمت نہیں تھی۔ اس کے پاس ان کا جواب نہیں تھا۔ اس کے پاس اپنے دکھوں کی صدائے باز گشت نہیں تھی۔ وہ شکست کھا گیا اور ایک دن گھر سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

اُس نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی پوری کوشش کی مگر اس بے رحم شہر میں بوجھ اٹھانے کے سوا باقی سارے راستے اس نے اپنے لئے بند پائے اور آج وہ خالی الذہن بس چائے پی رہا تھا۔ بمبئی میں اس نے کئی ہوٹلوں پر چائے پی تھی لیکن کاؤسں جی ہوٹل کی چائے کا مزا ہی کچھ اور تھا۔ وہ چائے کے دو پیالے پی چکا تھا اور اب سگریٹ سلگا کر ایک اور چائے کا پیالہ پینا چاہتا تھا۔ بمبئی میں آکر اس کی یہ عادت ہو گئی تھی۔ اس نے دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے ایک کپ چائے کا آرڈر پھر دے دیا اور اب اپنے سامنے بیٹھے ہوئے دبلے پتلے آدمی کو دیکھ رہا تھا جو کبھی تو اپنی پتلون کی جیب ٹٹولتا تھا اور کبھی اپنی سگریٹ کی ڈبیا کو کھولتا ۔۔ اور پھر بغیر سگریٹ نکالے بند کر لیتا۔ اس نے مرہٹی زبان میں بیرے کو کچھ آرڈر بھی دیا تھا لیکن کافی دیر سے بیرا اس کے لئے کچھ لایا نہیں تھا۔

وہ کچھ بے چین سا لگ رہا تھا اور اکیلا ہی میز پر بیٹھا تھا پریشانی کی حالت میں بار بار اس کا ہاتھ پتلون کی جیب کی طرف جاتا ۔۔ ہریش نے سگریٹ کا کش لے کر اپنی نظر اس سے ہٹا لی۔ وہ آج کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس کی نظریں کیوں بار بار اسی پر جا کر رکتی ہیں۔ دوپہر کے وقت یوں ہی ہوٹلوں میں بھیڑ کچھ کم رہتی ہے لیکن آج کاؤس جی ہوٹل میں صرف چھ آدمی بیٹھے تھے۔ ہریش خود ۔۔ وہ دبلا پتلا جوان اور کونے والے چار آدمی جواب ہوٹل کا بل چکا کر ہوٹل سے باہر جا رہے تھے۔ اب وہ دُبلا پتلا آدمی اپنی میز پر سے نظریں ہٹا کر

ہریش کو گھور رہا تھا۔ پھر اس نے بیرے کو بلا کر اسے باہر سے سگریٹ لانے کو کہا اور بیرا جب باہر چلا گیا تو وہ جلدی سے ایک چاقو نکال کر کاؤنٹر پر کھڑے ہوٹل کے مالک پر جھپٹا۔ مگر ہریش نے فوراً اٹھ کر اسے دبوچ لیا۔ اس کشمکش میں چاقو ہریش کا کندھا زخمی کر گیا۔ مگر اس شخص کو پولیس کے آنے تک نہیں چھوڑا۔ وہ آدمی گرفتار ہو گیا۔ پولیس نے ہریش کا پتہ پوچھا تو وہ سوچنے لگا کہ کیا بتائے۔ وہ تو پچھلے بیس پچیس دنوں سے فٹ پاتھ پر رہ رہا تھا لیکن ہوٹل کے مالک نے اس کی مشکل آسان کر دی اور کہا۔

" یہ میرے ساتھ رہتا ہے اسی بلڈنگ میں "

پولیس والوں نے چائے پی اور وہ مچھلی بھی کھائی جس کا آرڈر دبلے پتلے آدمی نے دیا تھا۔ ہوٹل کے مالک نے ڈاکٹر کو بلوایا۔ ہریش کے کندھے پر کافی گہرا زخم آیا تھا مگر بروقت ڈاکٹری امداد سے وہ بہت جلد سنبھل گیا۔ سیٹھ نے اسے پاس بٹھاتے ہوئے کہا " تم نے تو آج ہمیں بچا لیا بابو "

" آپ کی اس سے کوئی دشمنی " ہریش نے اپنا زخم سہلاتے ہوئے پوچھا۔

" نہیں دشمنی تو میری کسی سے بھی نہیں "

" تو پھر ایسا کیوں ہوا "

" یہ تو معلوم نہیں۔ لیکن تم نے ہمارا جان بچایا۔ تم بہت بھلا آدمی ہے "

" چھوڑو سیٹھ۔ کون کسی کی جان بچاتا ہے ۔ یہ تو اتفاق تھا "

" ہم بھی اتفاق ہی بولتا ہے بھئی۔ تم ادھر نہ ہوتا تو آج ہمارا جان ختم تھا۔ خدا نے تمہیں ہمارا جان بچانے کو ادھر بھیجا۔ ہم نے پہلے بھی تمہیں دو تین بار ادھر دیکھا ہے "

" ہاں سیٹھ ہم ادھر ہی تمہارے ہوٹل کے سامنے فٹ پاتھ پر رہتا ہے " ہریش نے اسی لہجے میں کہا

" ارے کاہے کو فٹ پاتھ پر رہتا ہے ۔ آج سے تم اس ہوٹل میں رہے گا۔ کوئی

دھندا کرتا ہے کہ بے کار ہے ؟"۔

" بے کار ہوں سیٹھ بالکل بے"

" اچھا ۔ اچھا ہم تم کو کام بھی دے گا ۔ رہنے کو جگہ بھی دے گا ۔ تم آج سے ہمارا بیٹا ہے ۔ ہم سے جو بن پڑے گا ۔ سب کچھ کرے گا تمہارے لئے ۔ تم اپنا سامان ادھر لے آؤ"

" سامان تو سیٹھ اپنا کچھ ہے نہیں ۔ ایک چٹائی ہے وہ سامنے درخت پر ٹنگی ہے ۔ کپڑے لانڈری میں اور ـــــ اور میں آپ کے سامنے"

" اچھا ۔ چلو تمہارا کمرہ تمہیں دکھلا دیں ۔ آج سے تم ادھر ہی رہے گا"

کاؤنٹر کے ساتھ ہی لکڑی کی سیڑھی چڑھنے کے بعد وہ ایک دوچھتہ سا تھا جس میں کاغذ ہی کاغذ بھرے پڑے تھے ۔ اس کمرے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جو ہوٹل کے رین شیڈ کے اوپر کھلتی تھی ۔

" یہ جگہ ہم ابھی صاف کرا دے گا ۔ تم ذرا نیچے بیٹھو" سیٹھ نے کہا

اور پھر ہوٹل کے صفائی کرنے والے ملازموں نے کاغذ کے کئی ٹوکرے باہر نکالے اور کمرہ کچھ کھلا کھلا سا نظر آنے لگا ۔ جب کھڑکی کے شیشے صاف ہوئے تو کچھ روشنی بھی اندر آ گئی تھی اور کھڑکی کو کھلنے پر ہوا بھی ۔ کھانا کھا کر ہرلش اس کمرے میں چٹائی پر لیٹ گیا ۔ وہ اب بھی کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا اپنے زخم کے بارے میں اور نہ ہی آج کے سانحے کے بارے میں ۔ اسے یہی خوشی تھی کہ اس کو رہنے کی جگہ مل گئی تھی ۔

شام کو جب وہ سو کر اٹھا تو ہوٹل میں بہت چہل پہل تھی ۔ ہوٹل کا مالک اس کو ریٹ لسٹ دے کر اور کاؤنٹر پر بٹھا کر باہر چلا گیا تھا ۔ ہوٹل میں آنے والا ہر آدمی اسے غور سے دیکھتا اور ہرلش اسے دیکھ کر مسکرا دیتا ۔ رات کے گیارہ بجے تک گاہکوں کا تانتا بندھا رہا ۔ وہ نوٹ آتے دیکھ کر حیران ہو گیا ۔ اتنے سارے روپے

اکھٹے ہوتے جا رہے تھے۔ کیش بکس بھرتا جا رہا تھا۔ وہ بڑی چستی اور تن دہی سے کام نپٹاتا رہا اسے اتنی فرصت نہیں ملی کہ وہ ایک پل کو اپنے زخم کے بارے سوچ لیتا۔

رات کے گیارہ بجے کے بعد جب بھیڑ قدرے کم ہوئی تو اس نے دیکھا کہ کوئی آدمی اس کے کاؤنٹر والی سیٹ پر بیٹھا اسے غور سے دیکھ رہا ہے۔ ہریش کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ مسکرا دیا اور ہریش کو بھی جواب میں مسکرانا پڑا اس کی شکل ہوٹل کے مالک سے کتنی ملتی تھی۔ ساڑھے گیارہ بجے ہوٹل کا مالک آیا تھا تو وہ آدمی اٹھ کر چلا گیا۔

ہریش نے کھانا کھایا اور ہوٹل کے مالک نے نوٹ گننے شروع کر دیئے اور حساب کتاب کرنے کے بعد اس نے ہریش ...... کو اسی طرح مسکرا کے دیکھا جس طرح تھوڑی دیر پہلے اس کے کاؤنٹر کے پاس بیٹھے ہوئے آدمی نے اسے دیکھا تھا۔ سب کاموں سے فارغ ہو کر ہوٹل کا مالک ہریش کو لے کر اوپر والے کمرے میں چلا گیا۔ پھر پانچ سو روپے مہینہ ہریش کی تنخواہ مقرر ہو گئی جو ہریش کی اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ تھی۔ ڈیوٹی صبح چھ بجے سے شام کے پانچ بجے تک کام وہی تھا جو آج اس نے کیا تھا۔ ایک کام اور بھی ہے۔ وہ پھر بتاؤں گا" سیٹھ نے کہا۔ کچھ ہی دنوں میں ہریش اپنی ایمانداری کی وجہ سے سیٹھ کے قریب تر ہو گیا تھا۔ اور پھر جب سیٹھ نے اسے دوسرے کام کے بارے میں بتایا تو ہریش تذبذب میں پڑ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ سیٹھ کو اتنی آمدن ہے اُس کو اس دھندے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ اتنے ڈھیر سارے روپے تو روز تھیلے میں ڈال کر گھر لے جاتا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ سیٹھ کو انکار کر دے۔ جس عذاب سے بچ کر وہ گھر سے بھاگا تھا۔ جو حالات اسے بمبئی لے آئے تھے وہی حالات اسے پھر اسی جہنّم میں دھکیلنے جا رہے تھے۔ اس نے انکار کر دیا ہوتا لیکن مسلسل بے کاری اور غربت اس کے

سامنے منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ سیٹھ کہہ رہا تھا "مجھے دیکھو۔ جب میں یہاں آیا تھا تمہاری طرح فٹ پاتھ پر سویا کرتا تھا۔ اس میں جھجکنے کی کوئی بات نہیں اور پھر تم نے تو میرا کام کرنا ہے۔ اس میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں۔ تمہیں تو ایک لڑکی کو لے آنا ہے اور لے جانا ہے۔ وہ میرے دوست کی لڑکی ہے "رشمی" میں سوائے تمہارے اور کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ سینے پر پتھر رکھ کے یہ کام میں بھی کر رہا ہوں"

وہ مان گیا اور جب اس نے پہلے دن گھر جاکر رشمی کو دیکھا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ کتنی خوبصورت کتنی باسلیقہ اور وضعدار تھی۔ وہ اسے بالکل ایک جوگن سی دکھائی دے رہی تھی جو شاید راستہ بھٹک گئی تھی وہ ایک ایسی مورتی تھی جسے سیٹھ کسی مندر سے چرا لایا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذ کا پرزہ جس پر نئے گاہک کا پتہ تھا۔ بچھو کی طرح کاٹنے لگا۔ مگر وہ اسے نہ پھینک سکا۔ لڑکی نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ اسے بیٹھنے کے لئے کہا اور پھر تیار ہو کر اس کے ساتھ چل پڑی۔

پھر یہ اس کا معمول بن گیا۔ سارا دن ہوٹل کے کاؤنٹر پر کام کرنا اور شام کو رشمی کو کہیں چھوڑنے جانا۔ رشمی نے اس دوران کبھی اس سے بات نہیں کی تھی۔ بس کبھی کبھار اُسے چائے کے لئے پوچھ لیتی تو اس کے دماغ میں ایک کھلبلی سی مچ جاتی۔ اس کا جی بارہا چاہا کہ وہ اس سے ڈھیر سارے سوال پوچھ لے لیکن نہ جانے کیوں اس کے ہونٹوں پر تالا لگ جاتا۔ اسے اکثر اپنی سوتیلی ماں یاد آجاتی وہ بھی رشمی کی طرح خوب صورت تھی۔ اس کو بھی حالات نے اس راستے پر لا کھڑا کیا تھا۔ لیکن رشمی؟ وہ تو پڑھی لکھی دکھائی دیتی تھی کہیں نوکری کر سکتی تھی۔ وہ اس راہ پر ـــــ

آخر ایک رات اس نے ... سیٹھ سے پوچھ ہی لیا تھا ـــ اس رات رشمی کو ایک عالیشان بنگلے میں چھوڑ کر جب وہ لوٹنے لگا تو ایک بھدے سے

مارواڑی سیٹھ نے اسے بھی دس روپے کا نوٹ دینا چاہا ـــ وہ بوڑھا کتنا موٹا تھا اور جب رشمی نے اس کے ساتھ ہنس کر بات کی تھی تو ہریش کے سینے پر سانپ لوٹ گیا تھا ۔ اسی رات ہوٹل کے مالک نے اس کا غصہ بھانپ کر ہوٹل بند ہونے کے بعد ساری کہانی اسے بیان کر دی ۔ وہ کہنے لگا " تم نے ہمارا جان بچایا تھا اس لئے ہم سب بات تم کو بتا رہا ہے ۔ خدا قسم ہم اس دھندا میں ایک پیسہ بھی نہیں کماتا سب اسے دے دیتا ہے ۔ وہ آدمی جو اس روز ہم پر حملہ کیا اس کا بہن بھی یہی دھندا کرتا ہے ۔ اس کا خیال ہے ہم اس کا دلالی کرتا ہے ۔ نہیں ایسا نہیں ہے توبہ توبہ ـــ دیکھو بیٹا ہم کسی کو اس کام سے روک تو سکتا نہیں ۔ ہم کسی کو اس کام کی ترغیب بھی نہیں دیتا لیکن جو اس راہ پر چل رہا ہے اس کا کوئی کیا کرے ۔ تم ہماری بات ایسے نہیں سمجھے گا ـــ سنو ـــ رشمی ہمارے دوست کا بیٹی ہے ۔ سمجھو وہ ہمارا ابھی بیٹی ہے ۔ اس کا شادی ایئر فورس کے ایک بڑے افسر سے ہوا تھا ۔ " لو میرج " اور ہم نے بہت ڈٹ کر ساتھ دیا تھا رشمی کا کیونکہ لڑکا پارسی تھا اور رشمی ہندو ۔ لیکن دونوں اتنا خوبصورت تھا اور ایک دوسرے کو اتنا چاہتا تھا کہ ہم بھی چاہتا تھا کہ دونوں کی شادی ہو جائے ۔ ہم نے اپنے دوست کو مجبور کر کے منا لیا تھا اور رشمی شادی کے بعد بہت خوش تھا ۔ اس کا باپ شادی کے بعد کنیڈا چلا گیا تھا اور ادھر ہی خدا کو پیارا ہو گیا تھا اور ادھر اچانک پاکستان اور ہندوستان کا جنگ ہو گیا اور رشمی کا خاوند لڑائی میں مارا گیا ۔ سرکار نے رشمی کو پنشن تو دیا لیکن اس سے کیا ہوتا ۔ پنشن سے تو اس فلیٹ کا کرایہ ہی مشکل سے ادا ہوتا ۔ رشمی کا ایک بیٹا بھی ہے اب وہ نو سال کا ہے بالکل اپنے باپ کی موافق اس کی پڑھائی اور جس علاقے میں وہ رہتی ہے اس کے رکھ رکھاؤ کے لئے پیسہ تو چاہیئے ۔ اس نے ایک جگہ آٹھ سو روپے مہینے پہ نوکری کر لی تھی لیکن اس کی خوبصورتی اور

بے بسی کو دیکھ باس اسے اوور ٹائم بٹھانے لگا تھا۔ رشمی کا بیٹا سکول سے لوٹ کر
پہر دن گھر کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اس کا انتظار کیا کرتا تھا اور رشمی کا باس آٹھ سو روپے
میں اس سے ہر طرح کا کام لینا چاہتا تھا۔

رشمی ایک روز روتی بسورتی میرے پاس آئی اس نے کھل کر مجھ سے اپنا دُکھ
کہا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اگر اسے یہی کچھ کرنا ہے " دنیا یہ سماج یہی چاہتا ہے تو پھر۔
اگر نوکری اسی سے قائم رہنی ہے تو وہ کیوں کسی کی نوکری کرے وہ اپنی مرضی سے
جب چاہے گی جائے گی جب چاہے گی انکار کر دے گی۔ وہ سارا دن تو اپنے بیٹے
کے پاس رہے گی۔ سکول سے آئے گا تو گود میں لے کر پیار تو کرے گی وہ سیڑھیوں
میں بیٹھ کر روئے گا تو نہیں وہ "

" میں نے اسے بہت سمجھایا تھا لیکن شاید مجھ سے پہلے اسے زمانہ سمجھا
چکا تھا اس کی کمپنی کا باس سمجھا چکا تھا۔ جہاں وہ اپنے خاوند کے پنشن کے
کاغذات لے کر جاتی تھی۔ وہ دفتر والے بھی اسے بہت کچھ سمجھانا چاہتے۔ اس کے
خاوند کے ساتھ کام کرنے والے دوسرے افسر بھی اسے بہت کچھ سمجھانا چاہتے
تھے لیکن شاید وہ خود ہی ان کے سمجھانے سے پہلے سب کچھ سمجھ چکی تھی۔
دیکھو بیٹا میری کوئی فیکٹری تو چلتی نہیں اور میرا اتنا بڑا کاروبار بھی نہیں —
پھر — پھر — وہ اب بہت خوش ہے جتنی اسے مہینے میں پگار ملتی تھی۔ وہ
اب تین چار راتوں میں پیدا کر لیتی ہے

" مجھے تنخواہ کب ملے گی سیٹھ " ہریش نے کہا۔

" چھ روز بعد۔ تمہارا مہینہ پورا ہونے پر "

چھ روز اس نے چھ برسوں کی طرح کاٹے تھے۔ اس دوران بھی وہ رشمی کو
ہر رات چھوڑنے جاتا تھا اس کا جی بھی کئی بار چاہا تھا کہ وہ اس سے پوچھے — کیا

پوچھے یہ تو شاید وہ بھی نہیں جانتا تھا لیکن اس کا جی چاہتا ضرور تھا۔

آج جب سیٹھ نے اُسے پانچ سو کے نوٹ دیئے تو وہ بہت خوش ہوا۔ بھاگا بھاگا لانڈری سے کپڑے لایا ایک امپورٹڈ سینٹ کی شیشی بھی خریدی۔ سیٹھ بھی اس کی خوشی سے خوش تھا۔ اس کی مونچھوں کے نیچے اس کی مسکراہٹ صاف صاف دکھائی دے رہی تھی اور اس نے کئی بار خدا کی بارگاہ میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔

ہریش کو بھی اس کی خوشی میں باپ کی شفقت کی جھلک نظر آئی۔ اور جب اس نے چپکے سے مٹھائی کا ڈبہ لاکر سیٹھ کے سامنے رکھ دیا تھا تو دونوں کے آنسو نکل آئے اور پھر ہوٹل کے سب عملے میں مٹھائی .... بانٹی گئی اور سیٹھ نے توفرطِ مسرت سے مٹھائی گاہکوں کو بھی کھلائی تھی

آج ہریش کو ایک دن کی چھٹی بھی دی گئی اور اب وہ سارا دن اپنے کمرے میں گنگناتا رہا یا سوتا رہا اور جب اس کی آنکھ کھلی تو چھ بجے تھے سیٹھ نے ہریش کو بلا بھیجا اور ایک پرچی جس پر کوئی پتہ لکھا تھا اس کو تھمائی

"نہیں سیٹھ۔ آج رشمی نہیں جائے گی"

"لیکن کیوں — اسے لے جاؤ بھئی" سیٹھ نے تعجب بھرے لہجے میں کہا۔

"کہاں لے جاؤں"

"یہ پتہ رہا"

کتنے پیسے ملیں گے اُسے۔ کتنے میں ٹھہرایا ہے سیٹھ"

ارے تم باؤلا ہوا ہے۔ پہلے تو تم نے کبھی ایسا نہیں پوچھا"

"سیٹھ معاف کرنا — آج رشمی نہیں جائے گی —"

ہریش نے ہوٹل سے نکل کر ٹیکسی والے کو آواز دی اور سیٹھ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور وہ ہاتھوں میں کاغذ کا پرزہ لے کر ہریش کے پیچھے باہر تک گیا لیکن اسی اثنا

میں ہریش ٹیکسی میں بیٹھ کر جا چکا تھا۔

ہریش کے دماغ میں سو سو کے نوٹ جگمگاٹ کاٹ کر ایک خوب صورت سے محل کا روپ دھارن کر چکے تھے اور اس کے ایک کونے میں رشمی ایک دلہن کی طرح سمٹی سمٹائی سجی سنوری بیٹھی تھی۔ لیکن وہ اپنا روپ کیوں بدل لیتی تھی۔ ابھی ابھی وہ رشمی تھی پھر یکایک اس نے اس کی سوتیلی ماں کا روپ اختیار کر لیا تھا اور جب اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا تو وہ پھر رشمی بن گئی تھی۔

وہ پھر سوچنے لگا۔ اس کے دماغ میں کیسی سوچ گھس گئی تھی۔ وہ کیسا قدم اٹھانے جا رہا تھا۔ یہ کیسی گالی تھی جو وہ اپنے آپ کو دینے جا رہا تھا جو پچھلے چھ سات سال سے وہ پڑوسیوں سے سنتا آیا تھا۔ محلّے بھر کے لوگوں کے قہقہے۔ زہر میں ڈوبے ہوئے فقرے۔ نہیں۔ نہیں۔ اس کا جی چاہا تھا کہ وہ ٹیکسی والے کو ٹیکسی واپس لے جانے کو کہہ دے۔

لیکن رشمی کتنی خوب صورت تھی۔ کیا ہوا جو ایک مہینے کی بیگار — اس کی آنکھیں اس کے رسیلے ہونٹ۔ اس کا سانچے میں ڈھلا جسم۔ اس کی سوتیلی ماں کا روپ رنگ بھی نکھر آیا تھا — لیکن اس کے دماغ میں اس کی سوتیلی ماں کیوں بار بار گھس آتی تھی — بار بار اسے اپنا سر جھٹکنا پڑ رہا تھا۔

وہ کیا کہے گا رشمی سے جاکر — وہ اسے لے کر جائے گا کہاں۔ پھر اس نے جلدی سے جیب میں سے سگریٹ نکالا اور سلگا کر پھر سوچنے لگا۔ سمندر کے کنارے وہ — ساری رات چاندنی میں اس کے بالوں سے کھیلے گا۔ اس سے باتیں کرے گا۔ وہ اسے بتلائے گا کہ وہ کیوں پنجاب سے بھاگ کر بمبئی آیا تھا۔ اور پھر وہ اس سے اس کی کہانی پوچھے گا اور تھوڑی سی کہانی سُن کر ہی کہہ دے گا کہ اسے سب کچھ معلوم ہے — وہ جانتا ہے کہ اس کے ایک سُندر سا بیٹا بھی ہے۔

جو اپنے باپ کی طرح مضبوط ہے اور ابھی سے اسے ہوائی جہازوں سے کھیلنا پسند ہے۔ اب تو اس کے سوتیلے بھائی بہن بھی موٹے موٹے اور مضبوط ہوتے جا رہے ہوں گے۔ لیکن وہ خواہ مخواہ کیوں اس کے دماغ میں گھسے چلے آ رہے تھے۔ آج اگر آج وہ پانچ سو روپے اپنی ماں کی جھولی میں ڈال دیتا تو وہ کتنا خوش ہوتی۔ وہ تو چالیس روپے لے کر بھی مسکرا دی تھی۔ چاہے وہ مُسکراہٹ چند دنوں کی تھی۔ یا چند لمحوں کی لیکن مسکرا تو دی تھی وہ۔ اس نے پھر اپنے سر کو جھنجوڑا اور سینٹ کی شیشی کھول کر اپنے کپڑوں پر Spray کی ساری ٹیکسی مہک اٹھی ڈرائیور نے مسکرا کر پیچھے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی جواب میں مُسکرا دیا۔ اب ٹیکسی گلی کا وہ موڑ کاٹ رہی تھی جہاں سے دو فرلانگ پر ہی رشمی کا گھر تھا۔ آج وہ کس رنگ کی ساڑھی پہنے ہو گی۔ کاش آج اس نے جوگیا رنگ کی ساڑھی پہنی ہو۔ اس میں وہ کتنی اچھی لگتی تھی۔ جوگن جیسی اور سنگترے کے ہلکے رنگ کی لپ سٹک۔ رشمی کو بناؤ سنگھار کا کتنا سلیقہ تھا۔ اور اس کی سوتیلی ماں کتنی پھوہڑ تھی اس معاملے میں۔ پوڈر لگاتی تو ایسے دھبے سے اس کے چہرے پر بکھر جاتے۔ اسے پھر اپنی گردن کو جھٹکا دینا پڑا اور جب ایک جھٹکے سے ٹیکسی رکی تو اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا اور جب اس نے بالکونی کی طرف نظر اٹھائی تو وہ.... ہکا بکا رہ گیا۔ رشمی سچ مچ جوگیا ساڑھی میں ملبوس کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے ٹیکسی والے کو پیسے دے کر رخصت کیا۔ وہ حیران تھا کہ رشمی کو کیسے پتہ چل گیا تھا کہ اسے جوگیا ساڑھی پسند ہے۔ پھر ہر ایک سیڑھی جیسے ایک پہاڑ بن گئی۔ اس کا سانس پھول گیا۔ اس کے ذہن کے پردے پر کئی تصویریں بنتی رہیں مٹتی رہیں۔ جھیل میں ایک برہنہ جسم کی پرچھائیں۔ پلنگ پر روتے بسورتے دو بچوں سے لپٹا ہوا ایک سایہ۔ پڑوسیوں کے گھروں کی چھتوں سے برستی گالیاں۔ محلے میں ٹولیاں

بنائے کھڑے لوگ۔ دلخراش چیخوں کا شور۔ ہوائی جہازوں کی گونج۔ جنگ میں مرنے والوں کی چیخ و پکار ۔۔ رشمی کے ہونٹوں پر Ripe orange کی لپ سٹک دبلے پتلے آدمی کے ہاتھ میں تیز دھار والا چاقو۔ ہوٹل کے مالک کی مونچھوں کے نیچے کی مسکراہٹ ۔۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ پاگل ہو جائے گا ۔۔ اور پھر اسے دروازے پر دستک نہیں دینی پڑی تھی ۔۔ رشمی دروازہ کھولے مسکراتے ہوئے اُس کے خیر مقدم کو موجود تھی ۔ اسے کیسے پتہ چل گیا تھا کہ اسے جوگیا رنگ کی ساڑھی ۔۔ وہ پھر سوچنے لگا تھا ۔۔ رشمی کی مدھر مسکان اس کے دماغ میں سے ہو کر اس کے دل کی گہرائیوں تک جا پہنچی تھی ۔ اس کے دل میں جیسے شفق کھل گئی ہو ۔۔ حد نظر تک پھیلی ہوئی سیندوری رنگ کی کرنیں " آپ بیٹھئے میں ابھی آئی " رشمی نے ہر روز کے معمول کی طرح کہا ۔

اس کے ذہن میں نقرئی گھنٹیاں بج اٹھیں ۔

اور پھر بجلی کی تیزی سے دروازہ کھلا اور ایک تیز چاقو کی دھار اس کے کندھے میں پیوست ہو چکی تھی ۔ ہریش کچھ بھی سمجھ نہ سکا اس کے سامنے ایک نو دس سال کا خوب صورت توانا لڑکا کھڑا تھا ۔

" تم میری ماں کو ہر رات کہاں لے جاتے ہو ۔۔ میں ۔۔ میں تمہیں جان سے مار دوں گا ۔۔ " وہ اپنے دانتوں سے اپنا ہونٹ چبا کر کہہ رہا تھا

برف کی سِل

خورشید آج بہت خوش تھی۔ ہوائی جہاز کے سفر کے خیال سے ہی اس کا من نیلے آسمان پر تیرتے ہوئے سفید سفید بادلوں کے ساتھ ساتھ اڑنے لگا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر اوپر چھت پر چلی گئی ـــ اس کے دماغ میں اور کوئی بات نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ ہوائی جہاز پر بیٹھی اڑی چلی جارہی ہے۔ کبھی بادلوں کی اوٹ میں اور کبھی بادلوں کے ساتھ ساتھ اور ہوا میں اس کا دوپٹہ اڑنے لگا تو اسے بالکل ایسا محسوس ہوا کہ وہ پری ہے اور وہ اپنے پروں کے سہارے۔ دریاؤں۔ سمندروں، پہاڑوں کے اوپر سے اڑی چلی جا رہی ہے۔ اس نے دور آسمان میں اڑتی ہوئی چیل کو دیکھا۔ جو ہلکے ہلکے بادلوں سے کبھی نمودار ہو جاتی اور کبھی چھپ جاتی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ابھی آسمان کے بادلوں پر تیرنے لگے ـــ "خورشید او خورشید چل نیچے ـــ اس کی ماں کی آواز نے اس کے سب خوابوں کو چور چور کر دیا۔ اور وہ نیچے چلی گئی۔

"اری تو چھت پر کیا کر رہی تھی ـــ تجھے کل دہلی جانا ہے۔ اپنے کپڑے لتے تو تیار کرلے۔" خورشید کو اپنی ماں سے ذرا بھی پیار نہ تھا۔ اور اس وقت تو اسے اپنی ماں پر بہت غصہ آتا جب اس کی ماں آئے دن اسے ایسے آدمیوں کے ساتھ بھیج دیتی۔ جن کی توند بڑھی ہوئی ہوتی۔ اور ان آدمیوں کے منہ سے سڑے ہوئے گوشت کی سی بدبُو آتی۔ اور جب وہ اسے جھنجھوڑتے اور خاص کر جب وہ

ان کی ہاتھا پائی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی - اور وہ یہ کہتے " پیسے نہیں دیئے گیا ــ " اس کا جی چاہتا کہ وہ ان کا منہ نوچ لے اور اپنی ماں ــ اپنی ماں کو ــ مگر۔ مگر وہ بے بس تھی -

اس کو اپنی ماں پر اس دن تو بہت ہی غصّہ آیا تھا - جب اس نے ایک بھاری بھرکم سیٹھ سے ڈھائی سو روپے ماہوار پر طے کر لیا تھا - وہ سیٹھ اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا - جس کے دانت بہت گندے تھے - اور اس کی آنکھوں سے گدلا گدلا پانی بہہ رہا تھا - اس کی ماں نے سیٹھ سے ڈھائی سو روپے لے کر اپنے بلاؤز میں رکھتے ہوئے اسے باہر بالکونی میں چلے جانے کو کہا تھا ــ شام کے چار بجے تھے اڑوس پڑوس میں بچّے سکولوں سے لوٹ رہے تھے - اور وہ سوچنے لگی تھی - کاش اس کی ماں اسے سیٹھوں کے ہاں بھیجنے کے بجائے سکول بھیجتی - وہ بھی نیلا گاؤن پہن کر ــ بستہ اٹھائے سکول سے لوٹتی ــ اور اس کی ماں بھی دروازے پر کھڑی اس کا انتظار کرتی - اور وہ بستہ ماں کے ہاتھ میں دے کر ــ گرم گرم چائے کا ایک پیالہ پی کر اپنی سہیلیوں کے ساتھ سامنے والے پارک میں کھیلنے جاتی اور پھر اس سے کوئی نفرت نہ کرتا ــ کوئی اس کے ساتھ کھیلنے سے انکار نہ کرتا - محلّے کے دوسرے بچّے اسے پارک میں آتا دیکھ کر اپنے اپنے گھروں کو بھاگ کھڑے نہ ہوتے - اور پھر فوراً ہی اس سیٹھ کا خیال آگیا جو اب بھی اس کی ماں کے پاس اندر بیٹھا زور زور سے باتیں کر رہا تھا ــ وہ کانپ کانپ گئی - یہ سوچ کر کہ اب تو اکثر اس سیٹھ سے واسطہ رہے گا ــ وہ ــ وہ سیٹھ تو اس کے باپ ــ وہ کچھ نہ سوچ سکی ــ اس کا باپ ــ کہاں ہے ــ کیسا ہے ــ اس نے اسے کبھی نہیں دیکھا - وہ کبھی اسے ملنے نہیں آیا - کبھی اس نے اسے پیار بھرا خط

نہیں لکھا۔ کبھی وہ اس کے لئے خوب صورت کپڑے لے کر نہیں آیا۔ کبھی پیار سے اس نے آکر اس کی پیشانی کو نہیں چوما۔ اور فوراً ہی خورشید کو سیٹھ کے گندے گندے دانت یاد آ گئے۔ وہ پسینہ پسینہ ہو گئی۔ جیسے سیٹھ منہہ کھولے اس کی طرف لپکا چلا آرہا ہو ــــ

پھر سیٹھ چلا گیا ــــ اس کی ماں سے کیا کچھ طے ہوا۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ البتہ وہ رات بھر پریشان رہی۔

ایک مہینہ گذر گیا اور سیٹھ کبھی نہیں آیا ــــ سات تاریخ کو اس کا منیم آیا تھا اور ڈھائی سو روپے کے نوٹ دے کر چلا گیا تھا۔ خورشید حیران تھی کہ یہ کیسا سیٹھ ہے جو پیسے بھیج دیتا ہے اور کبھی بھی اسے نہیں بلاتا اور اس کی ماں خوش تھی۔ کہ یہ پیسے تو مفت میں آجاتے ہیں۔ اور خورشید کو ادھر اُدھر بھیجنے میں اسے کوئی دقت پیش نہیں آتی ــــ ورنہ ایک قسم کا بندھن تو ہے ہی ــــ اچانک آج صبح منیم آیا تھا اور اس نے خورشید کو دہلی لے جانے کے بارے میں بات چیت کی تھی۔ پہلے تو اس کی ماں کسی طرح رضامند نہیں ہوتی تھی کہ خورشید کو اکیلی بھیجا جائے۔ لیکن منیم کے سمجھانے پر اور شاید کچھ اور روپوں کے لالچ میں آکر وہ مان گئی تھی اور جب خورشید کو پتہ چلا کہ وہ ہوائی جہاز میں دہلی جا رہی ہے تو بہت خوش ہوئی اور یہ جان کر کہ سیٹھ ساتھ نہیں جائے گا تو وہ بہت زیادہ خوش ہوئی۔ وہ دہلی میں کسی بڑے افسر کے لئے بھیجی جا رہی ہے۔ یہ بات اسے نہ تو بہت پسند تھی اور نہ ہی ناپسند ــــ اسے خوشی تھی تو اس بات کی کہ وہ دہلی جا رہی ہے اور ہوائی جہاز میں ــــــــ دہلی جہاں لال قلعہ ہے۔ جامع مسجد ہے۔ قطب مینار ہے ــــ اس کا دل بہت مسرور تھا۔ اس نے

ابھی تک کبھی دہلی نہیں دیکھی تھی ۔ لیکن اس کا ذکر اکثر ان کے گھر میں رہتا تھا ۔ اور اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ آٹھ نو سال کی تھی تو ایک آدمی اس کی ماں کے پاس دہلی سے آیا تھا ۔ اور وہ رات گئے تک اپنی ماں اور اس آدمی کی بات چیت سنتی رہی تھی ۔ اُسے اُسی رات پتہ چلا تھا کہ اُس کی ماں دہلی سے بھاگ کر بمبئی آئی تھی ۔ کیونکہ آنے والا شخص اس کا بھائی تھا ۔ جو اس کی ماں کو بھگا لایا تھا ۔ اور خورشید ان دنوں صرف چار سال کی تھی ۔ اور وہ شخص اس کی ماں کے ساتھ اس وقت تک رہا ۔ جب تک اس کی ماں کے پاس زیورات رہے ۔ اور جب اس کی ماں کی پونجی ختم ہوتی نظر آئی تو وہ بھاگ کھڑا ہوا ۔ اور آنے والا آدمی بتلا رہا تھا کہ وہ دہلی واپس نہیں گیا ۔ نہ جانے وہ زندہ بھی ہے یا نہیں ۔ اس کا کبھی کوئی خط نہیں آیا ۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ پاکستان چلا گیا ۔

خورشید کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس کی ماں نے جھجکتے جھجکتے خورشید کے ابا کے .... بارے میں پوچھا تھا اور اس نے کہا تھا ۔

" رحمت وہ تو درویش آدمی ہے ۔ اب بھی تمہیں یاد کرتا رہتا ہے ۔ جب کبھی بھولے سے تمہارا ذکر آتا ہے تو اس کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں ۔ اور " اللہ کی مرضی " کہہ کر چپ ہو جاتا ہے ۔ سارا دن قرآن پڑھتا ہے ۔ رات رات بھر مسجد میں عبادت میں مشغول رہتا ہے ۔ سبزی کی آڑھت میں پیسے اچھے بن جاتے ہیں ۔ چاہتا تو کب کا نکاح کر لیتا ۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا ۔ ساری کمائی غریب غربا میں بانٹ دیتا ہے ۔ اور اللہ اللہ کرتا ہے ۔ مجھ سے اکثر پوچھا کرتا ہے کہ کہیں رحمت ملی ۔ کیونکہ اسے پتہ ہے کہ میں اکثر بمبئی آتا جاتا ہوں ۔ لیکن تم سے کبھی ملاقات ہوئی ہی نہ تھی ۔

آج اچانک تم نے مجھے پہچان لیا نہیں تو خدا قسم میں تو پہچان ہی نہ سکتا ۔ تم تو دنوں میں ڈھل گئی ہو رحمت ۔ کہو تو خورشید کے ابا سے تمہارا ذکر کروں "

" نہیں ۔ نہیں ۔ ایسا نہ کر بیٹھنا ۔ میں اب اس کا سامنا نہیں کر سکتی ۔ مجھ میں اب ہمت نہیں کہ میں اس کے سامنے آنکھ بھی اٹھا سکوں ۔ وہ فرشتہ ہے میں نے اس کی قدر نہیں کی ۔ اور اب تو میں گناہوں میں اس قدر ڈوب چکی ہوں ۔ میرے اللہ ۔ میں گناہوں میں اس قدر ڈوب چکی ہوں ۔ " اور وہ رونے لگی ۔

پھر خورشید جاگ نہ سکی ۔ لیکن اس کے دماغ پر ایک دھندلی سی تصویر ضرور چھپ گئی تھی ایک فرشتے کی جو اس کا باپ تھا ۔ ایک موہوم سا چہرہ جو سارا دن قرآن پڑھتا ہے ۔ ایک انسان ۔ جو اپنی کمائی غریب غربا میں بانٹ دیتا ہے ۔ ایک نیک سیرت شخص جو اللہ اللہ کرتا ہے ۔ صبح جب خورشید جاگی ۔ وہ آدمی جا چکا تھا اور اُسے ایسا محسوس ہوا ۔ کہ اُس نے رات کو خواب میں اپنے ابا کو دیکھا تھا ۔ لیکن اس نے اپنی ماں سے اس بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا ۔ اور اس دن سے اسے اپنی ماں سے پیار نہیں رہا تھا ۔ وقت گزرتا گیا ۔ رحمت اور ڈھل گئی ۔ خورشید جوان ہونے لگی ۔ اس کی ماں کے پاس آنے والے گاہک اب خورشید کو اور ہی نظروں سے دیکھتے ۔ اور پھر ایک دن اس کی ماں اسے کار میں بٹھا کر ایک بہت بڑے محل میں لے گئی تھی ۔ جہاں ایک سیٹھ رہتا تھا ۔ وہ سیٹھ جسے اس نے اکثر اس کی ماں کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا ۔ خورشید کا جسم ایک معقول رقم کے عوض بک گیا ۔ وہ ہفتہ بھر اس محل رہی تھی ۔ لیکن وہ کچھ نہ سمجھ سکی کہ سیٹھوں کے پاس دولت کہاں سے آتی ہے ۔ مائیں اپنی بیٹیوں کو کیوں ان سیٹھوں کے پاس بھیج دیتی ہیں ۔ سیٹھ اتنے بھدّے کیوں ہوتے ہیں جبکہ ان کی کوٹھیاں ان کے موٹر اتنے خوبصورت ہوتے ہیں ۔ اور پھر ۔ پھر یہ روز کا معمول ہو گیا ۔ کہ رات رات بھر موٹے موٹے ۔ گدلے گدلے دانتوں والے ۔ مُنہ سے بدبو کے اٹھتے ہوئے

خواروں والے سیٹھ اس کی بوٹی بوٹی نوچ لیتے۔

کل اسے دہلی جانا ہے۔ یہ سبھی خیالات گڈمڈ ہو کر اس کے دماغ میں عجیب سی ہلچل مچا رہے تھے۔ کہیں دہلی میں اس کے ... اس کا دل دھڑک اٹھا۔ پھر وہ کام میں مشغول ہو گئی۔ اس نے اپنی ساڑھیاں درست کیں۔ بناؤ سنگھار کا سامان اٹیچی میں رکھا۔ پھر وہ اس سیٹھ کے بارے میں سوچنے لگی جو ہر مہینے اس کی ماں کو ڈھائی سو روپے دیتا ہے۔ اور خورشید کو اپنے ہاں کبھی نہیں بلاتا۔ سیٹھ کا اس افسر سے کیا رشتہ جس کے لئے اسے بھیجا جا رہا ہے۔ دہلی میں لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔ قطب مینار۔ جامع مسجد۔ اس کا ابا جو رات رات بھر مسجد میں قرآن پڑھتا ہے۔ یا اللہ۔ یا اللہ۔ اور پھر خورشید سو گئی۔

صبح آٹھ بجے موٹر کا ہارن بجا تو اٹیچی اٹھا کر جنگلی ہرنی کی طرح سیڑھیوں سے پھلانگتی ہوئی موٹر کے پاس پہنچ گئی۔ موٹر میں سیٹھ کا منیم بیٹھا تھا۔ خورشید کی ماں نے منیم سے کچھ بات چیت کی اور پھر موٹر بمبئی کی سڑکوں پر فراٹے بھرتا ہوا آبادی کو پیچھے چھوڑتا گیا۔ اور وہ ہوائی اڈے پہنچ گئی۔ اور اس کا دل ہوائی جہاز کے تصور ہی سے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ہوائی جہاز کو دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ وہ زور زور سے تالیاں بجائے اور وہ ناچتی گاتی ہوائی جہاز میں اکیلی سوار ہو جائے اور جہاز نیلے نیلے آسمان میں بادلوں کے آنچل میں جھولتا رہے جھولتا رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ہوائی اڈے کے اندر تھی اور جہاز سے لگی سیڑھی وہ اس طرح اچھل کود کر چڑھ گئی جانو ایک ہی چھلانگ میں وہ ہوائی جہاز میں نہیں بلکہ جنت میں پہنچ جائے گی۔ ابھی جہاز میں کوئی اور مسافر نہیں تھا اور اب وہ اس سوچ میں کہ کہاں بیٹھے۔ کبھی وہ بالکل آگے والی سیٹ پر جا بیٹھتی کبھی درمیان والی سیٹ پر بیٹھ کر شیشے میں سے باہر دیکھنے میں محو ہو جاتی۔ وہ اسی طرح اچھل کود کرتی رہی سیٹیں بدلتی رہی کہ اچانک ایک مسکراتی ہوئی خوبصورت لڑکی نے اسے ایک سیٹ پر بٹھا دیا۔ اب خورشید جہاز کو بھول کر اس لڑکی کے لباس اس لڑکی کے بولنے کے انداز۔ اس کی میٹھی مسکان۔ اس کے خوبصورت اور متناسب جسم کے بارے میں سوچنے

لگی اور اس لڑکی نے خورشید کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پھر ایک دلکش مسکراہٹ فضا میں بکھیر دی اور اس کے پاس آکر اس کے سنہری رنگ کے بالوں کی ایک لٹ ہاتھ میں لے کر اس کے حُسن کی بہت تعریف کی تو خورشید کو بہت مزا آیا۔ یوں تو خورشید نے اپنے بالوں اپنے ہونٹوں۔ اپنی ٹھوڑی۔ اپنی آنکھوں کی بارہا تعریف سنی تھی۔ اور پہروں آئینے کے آگے بیٹھ کر اس نے تعریف کرنے والوں کی نظر کو سراہا تھا لیکن آج اس کی تعریف میں کچھ انوکھا پن تھا۔ اپنی ہم جنس سے اور ایسے پیارے ڈھنگ سے اپنی تعریف سُن کر وہ مسکرا دی۔ پھر وہ شرما گئی لجا گئی۔

"دہلی کس کے پاس جا رہی ہو" وہ لڑکی بولی۔

خورشید اس سوال کے لئے تیار نہ تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور پھر اسے اپنے دل کی دھڑکن بند سی ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ ڈر گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ اس لڑکی کو کیسے پتہ چل گیا۔ وہ شرمندہ سی ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کہہ دے کہ وہ اپنے ابا کو ملنے جا رہی ہے۔ اپنے باپ کے پاس جا رہی ہے جو برسوں سے اپنے خدا سے اپنی بچی کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہا ہے۔ اور اس کے اللہ نے اس کی دعا قبول کر لی ہے۔ لیکن اسے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کیونکہ اب وہ لڑکی دوسرے آنے والے مسافروں کو اپنی جگہ پر بٹھا رہی تھی اور کبھی کبھار اس لڑکی کے گلے سے گھنگھرؤں کی سی آواز نکل کر جہاز کی ساری فضا میں بکھر جاتی۔ پھر تنیم اس کے پاس آ بیٹھا اور اس کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ اب جہاز کے اڑنے کا بے تابی سے انتظار کرنے لگی تھوڑی دیر کے بعد جہاز کے پنکھے گونج کے ساتھ چلنے شروع ہو گئے۔ جہاز سارا بھر چکا تھا۔ اور پھر جہاز آہستہ آہستہ رینگنے لگا۔ خورشید کا جی چاہا کہ وہ اپنی سیٹ پر کھڑی ہو جائے۔ زور زور سے تالیاں بجائے لیکن وہ چپ رہی۔ اس نے کھڑکی میں سے باہر کی طرف دیکھا۔ جہاز اب زمین سے اوپر اٹھنے لگا تھا۔ اور پھر اس نے دیکھا زمین دور ہوتی جا رہی ہے اور چیزیں چھوٹی ہوتی جا رہی ہیں۔ ہوائی اڈے پر کھڑے بڑے بڑے ہوائی جہاز اب کھلونے سے دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے پھر نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔ حد نظر تک آسمان کی نیلاہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اور کہیں کہیں بادلوں کی قطاریں۔ جیسے کسی دلہن کا جہیز بکھرا پڑا ہو۔ اور پھر نیچے نیلا سمندر۔ سمندروں میں سفید سفید بادلوں والی ننھی ننھی کشتیاں۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ پریوں کے دیس میں آ گئی ہے۔ جہاں رنگوں کا جادو ہے۔ رنگوں کی

بستی ہے اور رنگ۔ جو روح کی گہرائیوں میں اترتے جارہے تھے۔ یہ دُنیا اتنی خوبصورت ہے اتنی وسیع ہے یہ اسے آج محسوس ہوا منیم نے کئی بار خورشید سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بہت زیادہ محو تھی۔ باہر کی رنگ بھری دنیا۔۔۔۔۔۔ نرم نرم بادلوں میں اس کی خیالی انگلیاں گھس گئی تھیں اور وہ اپنی انگلیوں کے پوروں پر نرم نرم بھیگا بھیگا لمس بھی محسوس کر رہی تھی وہ سوچنے لگی کہ کاش وہ ساری زندگی یونہی فضا میں اڑتی رہے۔ اسے جب جہاز کی خوبصورت لڑکی نے فروٹ جوس پینے کو دیا۔ تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی اس کی جنت میں گھس آیا ہے۔ لیکن اس لڑکی کی مسکراہٹ نے اسے پھر اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا اور جب اسے منیم نے بتایا کہ وہ لڑکی جہاز پر نوکر ہے اور روزانہ اڑان کرتی ہے تو اسے اپنی ماں پر بہت غصہ آیا۔ اس کی ماں نے اسے جہازوں پر نوکر کیوں نہیں کروا دیا۔ آخر اس کی ماں کو تو پیسہ ہی چاہیے۔ اور وہ ساری تنخواہ اپنی ماں کو دیتی اور رفتہ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتی اور اچانک ہی خورشید کا دل ڈوبنے لگا۔ اور وہ ایک دم چونک سی پڑی۔ وہی خوبصورت سی لڑکی اس کی کمر میں لگی پیٹی کو کس رہی تھی اور اس کے بالوں سے اس کے منہ سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ کر اس کے نتھنوں میں پہنچی۔ اور اب خورشید کو اپنی روح میں رنگوں کی بجائے خوشبو کا چاؤ محسوس ہونے لگا۔

ہم دہلی پہنچ گئے ہیں اور اس آواز کے ساتھ خورشید کو اپنا دل ڈوبتا ہوا سا محسوس ہوا۔ جہاز اب نیچے اتر رہا تھا اور پھر جب جہاز اڈے پر اتر گیا تو اسے باہر جانے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ وہ سب سے آخر میں اپنی سیٹ سے اٹھی۔ وہ اس جنت سے باہر نہیں نکلنا چاہتی تھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ۔ ہوائی جہاز کا سفر کبھی ختم ہو۔ اُس نے سیٹ سے اٹھتے ہوئے بڑی حسرت سے جہاز پر نظر دوڑائی اور نیچے اتر کر ہوائی اڈے سے باہر نکلنے تک اس نے کئی بار مڑ مڑ کر جہاز کی طرف دیکھا تھا۔

اڈے سے باہر کار موجود تھی۔ منیم نے سامان ٹھیک کیا اور آناً فاناً کار دہلی کی سڑکوں پر فراٹے بھرتی دوڑی چلی جا رہی تھی۔

خورشید دہلی اور بمبئی میں ابھی تک کوئی فرق محسوس نہ کر سکی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ خواب سے ابھی ابھی چونکی ہے۔ خواب میں ہی وہ ہوائی جہاز پر سوار ہوئی تھی۔ اور اب بھی وہ خواب میں کسی سیٹھ کی کار میں بیٹھی ہوئی ایک

عالیشان کوٹھی میں بعد سے سیٹھ جس کے منہ سے سڑے گوشت کی سی بدبو ۔ وہ چونک پڑی ۔ منیم کا ہاتھ اس کے کندھے پر آگرا تھا ۔ اور وہ اب شرمندہ سا اپنا منہ باہر کی طرف کئے دبک سا گیا تھا ۔ شاید وہ اتنی سی بات کو بھی امانت میں خیانت سمجھ کر پچھتا رہا تھا ۔

بمبئی سے دہلی کے سفر کے دوران منیم نے خورشید سے کوئی بات نہیں کی تھی ۔ اگر اس نے کوئی بات کرنے کی کوشش کی تھی تو خورشید اپنے خیالوں میں اس قدر کھوئی تھی کہ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا ۔ منیم ادھیڑ عمر کا آدمی تھا ۔ ململ کی قمیض اور اجلی سفید دھوتی ۔ دبلا سا آدمی جس میں نہ کوئی کشش تھی اور نہ نفرت کئے جانے کے کوئی وجہ ہاں وہ خورشید سے ہمیشہ اس احتیاط سے بات کرتا جیسے وہ لڑکی نہ ہو بلکہ سیٹھ کی تجوری ہو جس کا وہ نگہبان ہے مالک نہیں ۔

اور پھر ایک بڑی سی بلڈنگ کے سامنے کار رک گئی اور منیم خورشید کو کار ہی میں چھوڑ کر اندر بلڈنگ میں چلا گیا اور پھر الٹے پاؤں لوٹ کر خورشید کو ساتھ لے گیا ۔ لفٹ سے وہ اور خورشید تیسری منزل پر پہنچ گئے ۔ خورشید کے ٹھہرنے کے لئے بہت ہی خوبصورت کمرہ تھا ۔ جزیری پردے ۔ دبیز غالیچے ۔ ٹیلی فون ۔ ریڈیو ۔ فرنیچر ۔ اور باتھ روم تو اس قدر خوبصورت تھا کہ ہائے اللہ ۔ پورے ، نہانے کے ٹب میں لیٹ جاؤ اور جس زاویئے سے چاہو اپنے جسم کے نشیب و فراز چاروں طرف لگے آئینوں میں دیکھ لو ۔ اور خورشید نے جب اس میں لیٹ کر فوارہ کھولا تھا تو سارے سفر کی تھکان ۔ دھل سی گئی اور وہ پہروں بیٹھی اپنا بناؤ سنگھار کرتی رہی اور منیم باہر بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا ۔

وہ باہر نکلی تو منیم چائے پی رہا تھا ۔ اور اچانک ہی جب اس کی آنکھ خورشید کے دھلے دھلے نکھرتے ہوئے چہرے پر پڑی تو پیالی اس کے ہاتھ سے گر گئی اور وہ کھسیاتا سا ہو کر پیالی کو اٹھا رہا تھا جو گرنے کے باوجود ٹوٹی نہیں تھی اور خورشید ۔ بڑے آرام سے منیم کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو منیم چونکا ۔

" ہاں جی ۔ سب ٹھیک ہے ۔ ہم پہنچ گئے ہیں ۔ (جی آپ دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے ۔ وہ تحفہ بھیجا ہے سیٹھ جی نے ۔ میں ابھی یہیں ہوں ۔ ساڑھے دس بجے ۔ اچھا جی ۔ نہیں صاحب کسی کو کانوں

کان خبر نہیں — وہسکی — اجی میں ابھی بازار جا رہا ہوں — سب انتظام ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں "

خورشید کو دوسری طرف کی آواز تو سنائی نہ دے رہی تھی البتہ وہ سب سمجھ گئی تھی کہ آنیوالا ساڑھے دس بجے آئے گا اور کمبخت شراب بھی پیتا ہے۔ اور اُسے بھی پینے کو کہے گا۔ خورشید کو شراب کا کڑوا کسیلا سواد بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہاں جب کسی جابر آدمی کے ساتھ رات کاٹنی ہوتی تو یہ کڑوا گھونٹ پینے میں کبھی نہیں ہچکچائی۔ چلو اس کی تو جے کھسوٹ کا رات کو تو نشے میں کچھ پتہ نہ چلتا۔ البتہ صبح انگ انگ میں درد جاگ اٹھتا —

اور رہی بھدے بھدے سیٹھوں کی بات تو وہ پیئیں یا نہ پیئیں — بات ایک ہی تھی — اور پھر اس کی ماں نے اُن سیٹھوں سے نپٹنے کے بہت سے طریقے سکھا دیئے تھے — بس ذرا — ہاتھ —

" منیم جی کتنے دن ٹھہرنا ہو گا یہاں "

" بس دو یا تین دن "

" تو مجھے — قطب مینار — لال قلعہ — جامع مسجد — "

" ہاں ہاں کل سارا دن یہیں گھومنا ہے — "

" دیکھئیے میں یہ سب جگہ دیکھ کر ہی لوٹوں گی — " خورشید نے ذرا پیار سے کہا۔

" ضرور ضرور " منیم نے باہر جاتے ہوئے کہا — " میں ایک گھنٹے میں لوٹوں گا — آپ کھانا کھا لینا — کھانا یہیں آ جائے گا بھجوائے دیتا ہوں — "

کھانا کھا کر خورشید سو گئی اور جب آنکھ کھلی تو رات کے آٹھ بج چکے تھے اور اسے گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ اُس نے جنوب کی طرف کی کھڑکی کھول دی اور باہر کھلی فضا میں جھانکا۔

باہر ایک مسجد تھی — مسجد کے مینار اس کی کھڑکی سے تھوڑا ہی اونچے تھے اور دور پیلا پیلا مرجھایا ہوا پورا چاند — سڑکوں پر دوڑتی ہوئی کاریں — خورشید سوچنے لگی — بمبئی اور دہلی میں فرق ہی کیا ہے — وہی موٹروں کی ریل پیل — وہی اونچی اونچی بلڈنگیں — وہی بیسے دبے چھپے کمرے — وہی شراب اور نسوانی جسم کے متوالے لوگ — پھر وہ چاند کو دیکھنے لگی جو مسجد کے میناروں سے دور بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا — اور اب چاند کا رنگ گہرا پیلا ہوتا جا رہا تھا اور اس کی چاندنی سڑکوں پر باغ پر مسجد پر ایک جادو

سا بکھر رہی تھی۔ خورشید نہ جانے کب تک سوچتی رہتی کہ اس کو مؤذن کی اذان نے چونکا دیا۔
اس نے مسجد کے آنگن میں دیکھا۔ چاند کی روشنی میں اسے مسجد کے آنگن میں کچھ سائے سے نظر آ رہے تھے۔ وہ کتنی دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ سب لوگ مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے اور پھر خورشید کے دل و دماغ پر اداسی سی چھانے لگی۔ اس کے کانوں میں صرف ایک آواز آ رہی تھی۔ قرآن کی آیتوں کی کچھ ان سُنے سے الفاظ۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ گر جائے گی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اس نے کھڑکی کے پٹ کا سہارا لے لیا۔ اس پر بے ہوشی سی چھانے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھاگ کر مسجد کے دروازے پر چلی جائے۔ اس مسجد میں چلی جائے جہاں لوگ نماز پڑھ رہے ہیں۔ یہی وہ مسجد ہے جہاں اس کا ان دیکھا باپ رات رات بھر عبادت کرتا ہے۔ وہ اسے کیسے پہچان سکے گی۔ وہ اس کا دامن پکڑ کر ابّا کہے گی۔ اور کہے گی۔ بولو ابّا پہچانتے ہو اپنی بیٹی کو۔ اور پھر رو رو کر اس کا دامن بھگو دے گی۔ اور کہے گی۔ ابّا مجھے اس گناہ کی دنیا سے بچا لو۔ بچا لو ابّا۔ مجھے اپنے سائے میں رکھو۔ اپنے اللہ سے میرا گناہ بخشوا دو۔ مجھے اس جہنم کی زندگی سے بچا لو۔ بچا لو ابّا۔ میں اس دوزخ میں نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے اپنی گود میں بٹھا لو۔ مجھے قرآن سناؤ ابّا۔ مجھے اللہ کی عبادت میں بہت سکون ملتا ہے۔ ابّا اپنی کمسن بچی پر رحم کھاؤ۔ اس بچی پر جسے تم پہچانتے نہیں۔ جو تمہارے ہوتے باپ کی شفقت سے بہت دُور۔ اور پھر منیم نے خورشید کو اس خواب سے چونکا دیا۔

"خورشید بائی وہ آ گئے ہیں۔ دیکھو خوش کر دینا ان کو۔ سیٹھ بہت سا انعام دیں گے۔" منیم یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔

خورشید نے محسوس کیا کہ اس کے جسم میں جان ہی نہیں۔ وہ ایک لاش ہے بس۔ اس نے دیکھا کہ ایک خوبصورت جوان کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دروازے کی کنڈی لگائی اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ نو وارد اسے گھور رہا تھا۔ خورشید نیم بے ہوشی کے عالم میں کبھی اس خوبصورت آدمی کو دیکھتی کبھی مسجد کے میناروں کو۔ جس کے پیچھے چاند اب بھی بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔
رات بھر مسجد میں کوئی اونچی آواز میں قرآن پڑھتا رہا۔ رات بھر آنے والا شراب پیتا رہا۔

رات بھر اس کی انگلیاں خورشید کے بالوں سے خورشید کے جسم سے کھیلتی رہیں۔ رات بھر خورشید مسجد کے میناروں سے پرے چاند اور بادلوں کی آنکھ مچولی دیکھتی رہی ــ اور کب صبح ہو گئی ــ اسے پتہ نہ چلا ــ وہ اس وقت چونکی اور چادر سے اپنا برہنہ جسم ڈھانپ لیا جب اُس نے افسر کی گرج دار آواز سُنی ــ وہ منیم سے کہہ رہا تھا ۔ اپنے سیٹھ سے کہہ دینا ۔ اُسے امپورٹ لائسنس نہیں ملے گا۔ یہ لڑکی سالی شراب بھی نہیں پیتی ــ ساری رات خراب کر دی ــ الو کا پٹھا سیٹھ ــ بمبئی کا تحفہ بھیجا ہے ــ ایسا ہوتا ہے تحفہ ـ نکل جاؤ یہاں سے ــ لے جاؤ اس برف کی سل کو اٹھا کر بمبئی ــ

خورشید سوچ سے بالکل عاری تھی ــ اس کے لئے ان گالیوں کا ــ ان الفاظ کا کوئی مطلب نہ تھا ۔ اُسے کچھ پتہ نہیں اس نے کب کپڑے پہنے کب وہ اس کمرے کی بلڈنگ سے باہر نکلی ۔ کب ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ ہوائی اڈے پر پہنچی ۔ کب اس کا ہوائی جہاز اڈے سے اُڑا ــ باہر آسمان کا کیا رنگ ہے ــ بادل کیا اب بھی قطار اندر قطار ان سفید بادبانوں والی کشتیوں کی طرح فضا میں تیر رہے ہیں ۔ اُسے کچھ پتہ نہ تھا ۔ لال قلعہ ـ قطب مینار ــ جامع مسجد ــ ان جانا باپ ــ مسجد کے آنگن میں کچھ سائے ــ قران خوانی کی آواز ــ وہ چپ تھی ــ خاموش تھی انسان کی بے بسی کی طرح ۔

رِشتہ

للّو سنت نگر کے جس مکان میں رہتا تھا یہ اسے وراثت میں ملا تھا۔ ایک کشادہ کمرہ نیچے آنگن اور آنگن میں اوپر جاتی ہوئی سیڑھیاں اور بالکل نیچے جیسا ایک کمرہ اوپر والی منزل میں اور بس مکان بہت اچھا بنا ہوا تھا۔ اور اس کے باپ نے اسی مکان سے ٹھیکے داری شروع کی تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے شہر کے سب سے خوبصورت علاقے میں ایک شاندار کوٹھی بنوائی تھی۔ اور اپنی دو لڑکیوں کی شادی پر سوا سوا لاکھ روپے خرچ کئے تھے۔ اور ایک لڑکا اس شہر میں مجسٹریٹ تھا۔

اس کی ماں اپنے بڑے لڑکے کے ساتھ اپنے خاوند کی کوٹھی میں رہتی تھی۔ اور کبھی کبھی اپنے بیٹے اروِن کمار کے ساتھ کار میں للّو سے ملنے آیا کرتی تھی۔

للّو پاگل تو نہیں تھا۔ لیکن وہ عقلمند بھی نہیں تھا۔ بہت بڑا سر۔ کھلی کھلی گول گول آنکھیں لٹکے ہوئے ہونٹ اور بہت جسیم تھا۔ اس کا باپ اسے لے کر ہندوستان کے سبھی بڑے شہروں میں بڑے بڑے ڈاکٹروں سے مل آیا تھا۔ لیکن اس کی جھولی میں کسی نے آس کے پھول نہیں ڈالے تھے۔ اور وہ رات دن اسی غم میں گھلتا رہا اور پھر ایک دن للّو کو حسرت سے تکتا ہوا راہیٔ ملکِ عدم ہو گیا تھا۔

اس کے بھائی نے اور ماں نے پہلے تو اُسے اپنے پاس ہی رکھا لیکن سبھی یہ محسوس کرتے تھے کہ اس کا وہاں رہنا ٹھیک نہیں کیونکہ بڑے بڑے آدمی ان کے ہاں آتے اور جب للّو کے بارے میں پوچھتے تو انہیں کچھ کہتے نہ بنتی اور پھر یہ فیصلہ ہوا کہ للّو کا انتظام سنت نگر والے مکان میں

کر دیا جائے اور وہاں اس کی دیکھ بھال کے لئے نوکر بھی رکھ دیا۔ لیکن دو چار دنوں میں ہی للّو نے نوکر کو بھگا دیا۔ اور اب وہ بہت خوش تھا.... اکیلا ....

کچھ ہی دنوں میں للّو محلّے بھر کا چہیتا ہو گیا۔ لڑکے اس کا مذاق اڑاتے اور وہ زور زور سے ہنس دیتا۔ محلّے میں گویا کسی نے زعفران چھڑک دیا تھا۔ جب دیکھو للّو کو دوکان دار لڑکے یا لڑکیاں گھیرے رہتیں اور پھر اتنے زور زور کے قہقہے اٹھتے کہ آسمان دہل جاتا۔

للّو کو اب روٹی کی بھی فکر نہ تھی۔ کبھی چھجو حلوائی کی دکان پر برتن صاف کر رہا ہے کبھی ہیمو پنساری کی بوری پیٹھ پر لادے جا رہا ہے۔ کبھی کسی بیمار کی دوائی لا رہا ہے یا بچوں کو لے کر سکول جا رہا ہے۔ اور کبھی کسی کی دیوار گر گئی تو اینٹیں اٹھا اٹھا کر مزدوروں میں شامل ہے یا کبھی چمپا بھٹیارن کی بھٹی میں ایک من جھونک رہا ہے۔ غرض یہ کہ کوئی لمحہ ایسا نہ گزرتا جب للّو کام میں نہ لگا ہو۔ اور جب سنت نگر میں بجلی بند ہو جاتی تو محلّے بھر کے لئے چار فرلانگ دور کوئیں سے پانی لا رہا ہے۔ اور کبھی ماتھے پر شکن نہیں ـــــ تھکن کا نام نہیں۔ اور جب دو تین سو بالٹیاں پانی کی لا کر سب کے گھروں میں پانی کے دریا بہا دیتا تو تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے چھجو حلوائی کے گھر کی ڈیوڑھی میں لیٹ جاتا اور بنتی حلوائن سے آلو کی کچوری کی فرمائش کرتا اور بنتی بھی اس کی فرمائش کو نہ ٹال سکتی۔ ویسے اس کی خوراک زیادہ نہ تھی۔ لیکن آلو کی کچوری وہ کھائے جاتا۔ اور بنتی پکائے جاتی۔

بنتی بہت ہنس مکھ عورت تھی۔ گورا چٹا رنگ اور کمر سے نیچے تک بال اور آنکھوں میں برسات پورے جوبن سے جھومتی تھی اور چھجو اتنا ہی سیاہ فام موٹا اور بدشکل تھا۔ اور بنتی کی دو جڑواں بیٹیاں تھیں۔ بالکل اپنے باپ کی طرح بدشکل اور موٹی موٹی جوانی کی حدوں کو چھوتی ہوئی۔

للّو ہر ایک گھر میں اس طرح گھس جاتا جیسے وہ کوئی انسان نہ ہو۔ بلکہ بلی کا بچہ ہو جو گھر میں آ ہی جاتا ہے۔ جسے کوئی نہیں روک سکتا۔ اسے سب بے ضرر بے وقوف اور اجڑ سمجھتے تھے۔ لیکن للّو بالکل ایسا نہ تھا جیسا لوگ خیال کرتے تھے۔ وہ کئی باتیں سمجھ کر بھی چپ رہتا۔ اور اس نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی۔ جس سے آئے گئے مہمانوں کے سامنے گھر والوں کی سبکی ہو۔ کپڑے پہننے کا اسے شوق تھا۔ لیکن اچھے کپڑے کبھی کسی کام کرنے میں آڑے نہیں آئے۔ وہ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے بھی کوئلے کی بوری اوپر کی منزل تک لے جانے سے نہیں ہچکچایا۔

محلے کے جوان چھوکرے اور جوان لڑکیاں للّو سے پیغام رسانی کا کام بھی لیتے تھے۔ اور وہ اس خوبی سے کام کو کرتا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی اور کئی بار جب کوئی لڑکا کسی لڑکی سے رات کے اندھیرے میں ملنے کے لئے وقت طے کرتا تو للّو اس مستعدی سے پہرہ دیتا اور کسی کے آنے کی اطلاع ان دونوں کو ایسے پہنچاتا کہ اچھے سے اچھے سی آئی ڈی کے آدمی بھی شاید نہ کر پاتا۔ اس لئے للّو بوڑھوں میں اپنے کام سے جوانوں میں پیغام رساں ہونے کی حیثیت سے اور بچوں میں ایک بولتا۔ چلتا پھرتا کھلونا تھا۔

کسی کا راز مجال ہے وہ کسی اور پر ظاہر ہونے دے یا کسی کا خفیہ کام کر کے اس لئے کسی قسم کے انعام کی توقع رکھی ہو۔ ہاں اُسے فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اور منچلے لڑکے اسے اس کا موقع اکثر مہیا کرتے اور وہ فلم دیکھتے ہوئے اس طرح محو ہو جاتا۔ جیسے وہ خود اس کا حصہ ہو۔ تمام فلم شو میں وہ آنکھ تک نہ جھپکتا اور گانا سنتے سنتے تو وہ کئی بار اپنی سیٹ پر دونوں پاؤں رکھ کر اکڑوں بیٹھ جاتا۔ ہاں اگر کوئی اس کے پاس بیٹھا بیٹھا کچھ بول دے باتیں کرنے لگے تو اسے بہت غصہ آتا۔ اور پردے سے آنکھیں ہٹائے بغیر ہی اپنا بھاری بھر کم ہاتھ بولنے والے کے کندھے پر رکھ کر اس طرح دبا تا۔ کہ بولنے والے کی گھگھی بندھ جاتی۔

تقریباً ہر ہفتہ اس کی ماں اور بھائی اسے کار میں ملنے آتے اور محلے بھر کے آدمی جب

اس کی تعریف کرتے تو اس کی ماں کی آنکھیں بھیگ جاتیں اور وہ کافی روپے بھی اسے دے کر جاتی۔ لیکن وہ چپکے سے سارے روپے بھائی کی جیب میں ڈال دیتا۔ اور بھائی کا ہاتھ کچھ اس ڈھب سے دباتا کہ وہ سسکیاں لے کر رونے لگتا لیکن للّو نے جیسے آنسوؤں کا مزا ہی نہ چکھا تھا۔ وہ ان کو نہ تو چپ کرانے کی کوشش کرتا۔ اور نہ ہی اپنا منہ لبسورتا وہ تو بس ہنسنا جانتا تھا۔ دُکھ ہو یا سکھ اس کے ڈھلکے ہوئے ہونٹوں پر خوشی کی لکیریں بکھرتی رہتیں سمٹتی رہتیں۔

اس کا بھائی جاتی بار چھجو حلوائی سے اس کے کھانے پینے کا بل پوچھتا۔ اور چھجو حلوائی یونہی کھاتہ کھول کر تیرہ روپے چودہ آنے یا گیارہ روپے نو آنے کا بل ہر ہفتہ ضرور بنا دیتا۔ جس کا للّو کو بھی علم تھا۔ لیکن وہ کبھی کچھ نہیں بولا۔

للّو کو دو باتوں میں بہت زیادہ لطف آتا تھا۔ ایک تو جب بجلی بند ہو جاتی اور پانی کا نہ ہونا محلّے بھر میں کربلا کا نظارہ پیش کرتا۔ تو وہ بہت خوش ہوتا۔ کیا کیا التجا بھرے لہجے میں جوان لڑکیاں اپنا گھڑا یا بالٹی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے "للّو راجہ مجھے پانی نہ لا کر دو گے؟" اور پھر ان کی چوڑیوں کی جھنکار جیسے اس کے دماغ میں سوچ کے جھرنے کھول دیتی اور وہ پہروں اپنی آنکھوں کے سامنے گوری گوری کلائیوں میں لال۔ ہری۔ اور کالے رنگ کی چوڑیوں میں سے نکلتے ہوئے رنگ برنگے ستارے سے ناچتے محسوس کرتا اور اسے بہت بھلا معلوم ہوتا اور وہ بجلی بند ہونے کی دعائیں مانگا کرتا دوسرے جب اسے بنتی اپنی پیٹھ دبانے کو کہتی تو اسے اپنی ہتھیلیوں میں ایک جلن سی محسوس ہونے لگتی۔ اور وہ جلن آہستہ آہستہ ایک انگارے کی سی شدّت اختیار کر لیتی۔ اور پھر جب تک اس کا ہاتھ اس کے اونچے بلاؤز اور نیچی ساڑھی کے وسط والے حصّے کو چھو نہ لیتا جلن اور بڑھتی رہتی۔ پھر جیسے جسم کو چھوتے ہی وہ جلن غائب ہو جاتی۔ وہ بنتی کی کمر دباتا رہتا۔ اور بنتی ہائے ہائے کچھ اس انداز سے کہتی رہتی کہ اسے یہ پتہ نہ چلتا کہ وہ درد سے کراہ رہی ہے یا

اس کے ہاتھوں کے دباؤ سے اور اس کے گھنے بالوں کو آہستہ سے چھوکر ایک طرف کرتے وقت تو اس کا ماتھا دہکنے لگتا۔ اور بنتی کی پنڈلیوں سے اٹھتی ہوئی ساڑھی ۔۔ اور وہ بنتی کے کہے بغیر اس کی پنڈلیوں کو دبانے لگتا۔ اور اب بنتی کی ہنیں للو کی ہائے کرنے کی باری ہوتی۔ لیکن اس کی آہ اس کے دل کے اندر ہی اندر رہتی اور کبھی ہونٹوں پر نہیں آئی - ہاں جب کبھی بنتی نے اسے اپنے کندھے دبانے کو کہا تو للو اس کی آنکھوں میں ضرور دیکھتا اور عموماً بنتی اپنی آنکھیں جھکا لیتی۔ اور وہ اس کے کندھوں کو دباتا رہتا۔ اور بنتی کے سانسوں کی بھینی بھینی سی خوشبو اس کے چہرے پر بکھرتی - تو وہ اٹھ کر چلا جاتا۔ اور وہ بنتی کی نگاہوں کے بلاوے کو جانے سمجھتا تھا کہ نہیں یہ للو ہی جانتا تھا۔ ہاں کیونکہ وہ مورکھ تھا۔

آج پھر محلے بھر میں پانی نہیں تھا اور للو نے کوئیں سے پانی لانے کی مہم شروع کر دی تھی۔ اور آج وہ معمول سے زیادہ تھک گیا تھا۔ بنتی کے دروازے پر قفل لگا تھا اور وہ تھکا تھکا سا اپنے مکان میں آکر حیران رہ گیا۔ وہاں کوئی آدمی چارپائی پر بیٹھا شیو بنا رہا تھا۔ للو نے اس آدمی کو اور اس آدمی نے للو کو دیکھا۔ للو خاموش واپس چھجو حلوائی کی دکان پر آگیا۔

" ارے ہاں للو۔۔ وہ نئے انسپکٹر آئے ہیں۔ اور انہیں کوئی مکان نہیں مل رہا تھا۔ میں انہیں تمہارے ہاں چھوڑ آیا تھا۔۔" چھجو نے رس میں جلیبی ڈبوتے ہوئے کہا۔۔ للو نے کچھ نہیں کہا۔۔ اور اندر دکان میں جاکر بنچ پر لیٹ گیا۔ اب للو گھر نہیں جاتا تھا۔ کبھی چھجو کی دکان پر اور کبھی چمپا بھٹیارن کے چھپر تلے رات کاٹ دیتا۔ اتوار کو اس کے بھائی اور ماں نے آنا تھا۔ اور چھجو نے انسپکٹر کا سامان اوپر والے کمرے میں منتقل کر دیا تھا۔ اور للو پھر اپنے گھر میں آگیا۔ آٹھ نو بجے اس کا بھائی اور ماں وداع ہوئے اور للو کواڑ بند کرنے لگا۔ اور اوپر

سے شیلا جو بنتی کی بڑی لڑکی یعنی جڑواں لڑکیوں میں سے پہلے پیدا ہونے والی اُتر رہی تھی۔ للّو کی آنکھوں میں نہ کوئی حیرت تھی نہ کوئی تعجب کی لکیر۔

وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر ایک طرف ہوگیا اور شیلا کچھ شرماتی جھجکتی بدن چرانی آنکھیں نیچے کیئے باہر چلی گئی۔ اور پھر انسپکٹر پہروں للّو کے پاس بیٹھا رہا۔ اور للّو حسبِ معمول چپ تھا۔ کافی دیر کے بعد انسپکٹر اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا اُٹھ کر چلا گیا۔

للّو کو نیند آرہی تھی کہ اچانک محلّے میں شور مچ گیا۔ اور للّو چارپائی سے اٹھ کر محلّے میں آگیا۔ محلّے میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ کوئی کسی سے بات کرنے کو تیار نہیں تھا۔ چھجو حلوائی کی دکان پر بھیڑ تھی۔ اور کوئی آدمی سڑک کے بیچوں بیچ خون میں لت پت لوٹ رہا تھا۔ اور چھجو ہاتھ میں چاقو لیئے بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ بنتی زار و قطار رو رہی تھی۔

پھر پولیس آگئی۔ چھجو کو پکڑ کر لے گئی اور للّو کو کچھ بھی پتہ نہ چل سکا۔ ہاں دوسرے دن چھجو کی دکان بند تھی اور محلّے میں لوگ ٹولیاں بنائے کھڑے تھے۔ شام کو بنتی نے للّو کو ٹیکسی میں بٹھایا اور اس کے بھائی کے گھر لے گئی۔ للّو اپنے بھتیجوں کے ساتھ کھیلنے میں مشغول ہوگیا۔ اور بنتی اس کی ماں کے پاس بیٹھی رات کے قصّے کو دہرا رہی تھی۔ اور للّو کی ماں سے کہہ رہی تھی۔ کہ وہ للّو کے بھائی سے سفارش کردے اور چھجو کو بچالے۔ للّو کی ماں ویسے کبھی دفتری معاملوں میں دخل نہیں دیا کرتی تھی۔ لیکن اچانک ہی اس کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ "بنتی تیرا کام تو ہو جائے گا۔ چاہے جیسے بھی ہو لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔ تجھے معلوم ہے للّو کیسا بھی ہے۔ میرا بیٹا ہے اور کب تک بھلا وہ اس طرح زندگی کاٹے گا۔ اس کے نام پر اس کا باپ چالیس ہزار روپے چھوڑ گیا ہے۔ مکان ہے۔ اگر تو

اپنی لڑکی کی شادی ۔"

للّو کی ماں نے ابھی یہ فقرہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ بنتی بولی ۔" مجھے منظور ہے۔" شیلا کی شادی شیلا کے پتاجی کے بری ہوتے ہی ہو گی ۔"

" تو جا ۔۔ میں بہت خوش ہوں اور تیرا کام بھی ہر حالت میں ہو گا " للّو کی ماں نے کہا ۔ بنتی آتی بار جتنی پریشان تھی جاتی بار اتنی ہی خوش تھی ۔ للّو کو لے کر ٹیکسی میں بیٹھ کر للّو سے کہنے لگی ۔" للّو تیری شادی میں شیلا سے کروں گی اور بہت ٹھاٹھ سے " للّو کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں تھی اور ہنسی کی ویسی ہی آڑی ترچھی لکیریں اس کے ڈھلکے ہونٹوں پر کھیل رہی تھیں ۔

چھ مہینے مقدمہ چلتا رہا ۔ چھ مہینے لگاتار شیلا انسپکٹر کے پاس آتی جاتی رہی چھ مہینے لگاتار للّو محلّے والوں کے کام کرتا رہا لیکن اس کی خوشی اسی میں تھی کہ بجلی بند ہونے سے پانی بند ہو جائے اور بنتی اپنی گوری چٹی بیٹھ ، گدرائی پنڈلیاں اس سے دبواتی رہے ۔ پھر چھجو صاف بری ہو گیا ۔ دوکان کھل گئی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں ۔ اور پندرہ دن کے اندر اندر للّو کا گھر بس گیا ۔۔ انسپکٹر نے مکان تبدیل کر لیا ۔ دولہن کو گھر چھوڑ کر للّو کی ماں بہنیں اور بھائی جا چکے تھے ۔ چھجو دوکان کی چھت پر ہی تھکا ہارا سو گیا تھا ۔

للّو میں کوئی فرق نہیں تھا ۔ شیلا سہمی گھبرائی سی اس کے کمرے میں بیٹھی تھی ۔ رات کے بارہ بجے تھے ۔ للّو اٹھا اور باہر گلی میں آ کر اس نے لمبا سانس لیا ۔ اور بنتی کے گھر کی طرف چل دیا ۔ اس نے کنڈی کھٹکھٹائی ۔ بنتی تھکی ہوئی تھی ۔ لیکن یہ سوچ کر کہ چھجو ہو گا اس نے دروازہ کھول دیا ۔

" للّو تم " وہ حیرانی سے بولی ۔

" ہاں ہیرا ۔۔ میں نے سوچا کہ حلوائن بہت تھک گئی ہو گی اس کی پیٹھ دبا آؤں ۔"

عجیب سی تھکن بنتی کے انگ انگ میں عود کر آئی اور وہ اوندھے منہ بستر پر لیٹ گئی۔ وہ اس کے بلاؤز اور ساڑھی کے درمیانی پیٹھ کے حصّے کو دبانے لگا۔ اور بنتی ہائے ہائے کرنے لگی ـــ پھر للّو نے بنتی کے بالوں کے گچھے کو چھوا اور اس کا ماتھا دبکنے لگا۔ بنتی کی پنڈلیوں سے ساڑھی اوپر اٹھ گئی تھی۔ اور للّو ہانپتا ہوا اُس کی دونوں پنڈلیوں کو ہاتھ میں لے کر دبانے لگا۔ اور آج اس کے ہونٹوں سے ہائے نکل ہی گئی۔

بنتی اب اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ آج للّو کے ہاتھوں کی گرفت پہلے جیسی نہیں تھی۔ للّو اب اس کے کندھے دبا رہا تھا۔ بنتی کے سانسوں کی مہک للّو کے منہ پر بکھرتی گئی۔ آج وہ بھاگا نہیں۔ اس نے بنتی کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"للّو پہلے تو تو نے کبھی ایسا نہیں کیا۔" بنتی نے اس کے سینے سے چمٹتے ہوئے کہا۔

"پہلے ہمارا کوئی رشتہ تھوڑے ہی تھا۔" للّو نے بنتی کے گلابی ہونٹوں کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا۔

تیسرا گھر

پاکستان کے ہاتھوں سے نکلنے کے بعد بنگلہ دیش سے لوٹا ہوا مال اور سامان کلکتہ کے ہر موڑ پر ایک چوک ہر بلڈنگ کے کونے میں بک رہا تھا اور کلکتے والے اس مال پر یوں ٹوٹ پڑے تھے جیسے کسی جانور کی لاش پر گدھ۔ مجھے پانسو روپے میں جاپانی ٹو اِن وَن ملا تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں نے ہندوستان کی حکومت اونے پونے خرید لی ہو۔ کاغذ میں چھپا کر جب میں اسے گھر لایا تو میں اپنی تقدیر پر بہت نازاں تھا کہ کتنا اچھا مال کتنے سستے داموں ہاتھ آگیا تھا۔ میں اس کے سوئچ آف آن کرنے لگا اور فوراً ہی چونک اٹھا کہ اس میں ٹیپ بھی تھی اور اس میں بہت ملائم اور صاف آواز سنائی دے رہی تھی

" پنڈت جواہر لال نہرو وزیر ہند کا خط موصول ہوا جس میں انہوں نے مجھ سے پوری پوری ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ ان کا خط اب بھی میرے پاس موجود ہے وہ اس خط میں یوں رقم طراز تھے

برادرم عبدالشکور

آپ کا خط ملا جس میں آپ نے میرے ساتھ احمد نگر جیل میں کاٹے دنوں کا ذکر کیا ہے۔ میں نے اپنے دماغ پر بہت زور ڈالا پھر بھی میرے ذہن میں آپ کی تصویر نہ ابھر سکی۔ آپ کی شبیہہ اپنے ذہن کے پردے پر

نہیں لاسکا۔ آپ نے جن واقعات کا ذکر کیا ہے یا جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان سے یقیناً ایسا لگتا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ تھے۔ میں معافی کا خواستگار ہوں کہ میں آپ کو پہچان نہیں پارہا ہوں۔ کاش آپ میرے سامنے ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ میں آپ کو پہچان لیتا۔

آپ کے طویل خط سے اہم اہم باتیں میرے سیکرٹری نے مجھے بتائی ہیں۔ میں آپ کی اور آپ کے خاندان کی جنگ آزادی میں قربانیوں سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ میری نظروں میں آپ کے والد کی عزت بہت بڑھ گئی ہے اور میں مانتا ہوں کہ ایسے اور سینکڑوں آزادی کے پروانے ہوں گے جن کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ آپ کے خاندان کا ذکر جب ہندوستان کی نئی تاریخ لکھی جائے گی۔ سنہری الفاظ میں کیا جائے گا اور ہر ہندوستانی کا سر آپ کے خاندان کی قربانیوں کا ذکر پڑھ کر فخر سے اونچا ہو جائے گا۔

فسادات کا جو ذکر آپ نے کیا ہے یقیناً وہ ایک بربریت کا ننگا ناچ ہے اور میری ہمدردی ان تمام بے گناہوں کے ساتھ ہے جو بلاوجہ صرف اپنے مذہب کی بنا پر مارے جارہے ہیں۔ آپ کا یہ عزم کہ آپ ان سب مسلمانوں کی حفاظت کے لئے ڈٹے رہیں گے قابل صد ستائش ہے۔ میں یہ ہی چاہوں گا کہ آپ یہ ملک چھوڑ کر نہ جائیں۔ یہ بربریت کی لہر بہت دنوں تک نہیں رہے گی اور ہماری حکومت بہت زوروں سے اس پر قابو پانے کی کوشش میں ہے آپ جیسے لوگوں کی ہمیں سخت ضرورت ہے۔ میں بہار کے وزیر اعلیٰ کو ذاتی خط لکھ رہا ہوں اور احتیاطاً ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو بھی ذاتی

مراسلہ بھیج رہا ہوں۔ وہ آپ کی اور آپ کے خاندان کی حفاظت کریں گے اور دیگر مسلمانوں کی بھی دیکھ بھال ملحوظ رکھیں گے۔

مخلص

جواہر لال نہرو

میں یہ خط پاکر بہت خوش ہوا تھا اور جب میں نے وہ خط اپنے بوڑھے باپ کو سنایا تو اُس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو اُمڈ آئے تھے اور میری بیوی نے تو مسلمانوں کے گھر گھر جا کر وہ خط دکھایا تھا۔ ان لوگوں کو جو سامان باندھ کر پاکستان کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ ہر طرف قتل و غارت کے باوجود گھر یلو سامان پھران طاقتوں کی زینت بن گیا تھا جو تھوڑی دیر پہلے منہ پھاڑے ہر گھر والے کو تکنے لگے تھے۔ میں وہ خط لے کر اپنے ضلع کے ڈپٹی کمشنر سے ملنے گیا۔ لیکن اس کی بے اعتنائی۔ لاپرواہی اور سرد مہری کو دیکھ کر مجھے یہ خط اس کو دکھانے کا حوصلہ ہی نہ ہوا۔ اس نے وزیر اعظم کے خط ملنے کا ذکر کیا تھا لیکن اپنی بے بسی کا رونا زیادہ رویا تھا۔ اس کے دماغ میں انگریزوں کے راج کی بو اتنی رس بس چکی تھی کہ میرے لاکھ سمجھانے پر اپنے خاندان کا پورا بیورا دینے کے باوجود اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی تھی

میں گھر واپس لوٹا تو گھر لٹ چکا تھا۔ ابا کا قتل ہو چکا تھا میری بیوی محلے کے اس نوجوان سے وہ شال چھین رہی تھی جو میری دادی اماں نے اپنی بوڑھی عمر میں جہاں رات رات بھر اللہ سے سب کی سلامتی کی دعائیں مانگی تھیں وہاں یہ شال بھی کاڑھی تھی۔ میں پہنچا تو اس نے عجیب نگاہوں سے میری طرف دیکھا ایک التجا بھری نظر سے لیکن وہ لڑکا شال چھین کر بھاگ گیا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا وہ جگل کشور کا بیٹا تھا۔ میرے بچپن کے ساتھی کا بیٹا۔ جن کے خاندان سے کئی پشتوں سے

ہمارے تعلقات چلے آرہے تھے۔

ابا کی لاش کو ٹھکانے لگاتے وقت جنازے کے ساتھ صرف چند آدمی تھے حالانکہ چار سال پہلے جب ابا جیل سے رہا ہو کر آئے تھے تو سارے کا سارا شہر ان کے خیر مقدم کے لئے جلوس میں شرکت کے لئے ٹوٹ پڑا تھا جس کا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری دادی اماں صبح سے شام تک چرخہ چلاتی یا یادِ خدا میں مشغول رہتی تھی۔ اس نے اپنے چرخے پر گاندھی جی کی تصویر لگا رکھی تھی۔ اور جب وہ تھک جاتی تو یادِ خدا میں غرق ہو جاتی اور نماز کے بعد اس کی دعا کے لفظ اب بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ "اللہ گاندھی جی کو عمر دراز دے اور ملک ان فرنگیوں کے ہاتھوں سے جلد آزاد کرا دے" اور جب ابا جیل سے رہا ہو کر آتے تو میری دادی اماں کہا کرتی تھی عبدالکریم لوٹ آئے ہو جیل سے اب پھر کب جاؤ گے جیل جیسے جیل یا ترا نہ ہوئی حج شریف ہو گیا۔ اور ابا بھی صبح جیل سے چھوٹتے شام کو پھر شہر کے میدان میں دھواں دھار تقریر۔

مجھے یاد ہے ۱۹۴۲ء کی تحریک میں جب میری ماں پردہ چھوڑ کر اتر آئی تھی میدان میں اور جٹ گئی تھی کانگریس کے کام میں اور جلد ہی پکڑی گئی تھیں۔ میں احمد نگر جیل میں تھا ابا ہزاری باغ جیل میں۔ ہم کو ماں کی بیماری کا پتہ چلا۔ جیل میں اماں کو سل کی بیماری ہو گئی تھی ابا نے مشروط رہائی سے انکار کر دیا تھا ادھر مجھے پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد نے بہت حوصلہ دیا تھا اور میں نے پیرول پر رہائی سے صاف صاف انکار کر دیا تھا حالانکہ اگر میں درخواست دے بھی دیتا انگریز سرکار وہ درخواست ضرور رد کر دیتی۔ کیونکہ اس وقت تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ بڑے بڑے سیاسی قیدی کہاں رکھے گئے تھے اور میرے باہر آنے سے حکومت کا یہ راز راز نہیں رہتا۔ پھر ماں مر گئی تھی۔ ہمارے آبائی گھر

میں کیونکہ حکومت نے ان کی نازک حالت دیکھ کر ان کے مرنے کے دس دن پہلے انہیں رہا کر دیا تھا۔ اور پھر سُنا تھا کہ شہر میں اتنا بڑا ماتمی جلوس کبھی نہیں نکلا۔

جب ہم جیل سے لوٹے تو میرا لڑکا آفتاب پڑھائی چھوڑ چکا تھا۔ تین سال کے اس عرصے میں گھر والوں نے سب کچھ بیچ کھایا تھا جو ابّا نے مدراسی لنگیوں کے بیوپار میں کبھی کمایا تھا۔ رخسانہ میری بیٹی البتہ اسکول جاتی تھی۔

عبدالستّار میرا بھائی جو ٹوپیوں کی دوکان کرتا تھا پولیس کے ہاتھوں بہت تنگ رہا تھا کیونکہ اس کی ایک لڑکی سوشلسٹ پارٹی کی سرگرم ممبر تھی اور ایک دن ریل کی پٹری اکھاڑتے ہوئے گولی اس کے سینے کے پار ہو گئی تھی۔

میں ابّا کی قبر کے سرہانے کھڑا سوچ رہا تھا۔ اس دن کی بات جب ۱۵ اگست کو انہوں نے ترنگا جھنڈا لہرایا تھا۔ جس روز وہ دن طلوع ہوا تھا جس کے لئے ہمارے جیسے ہزاروں خاندان قربانیاں دے چکے تھے اگرچہ قتل و غارت کا بازار گرم تھا میری بوڑھی دادی پوپلے منھ سے ابّا کو مبارکباد بھی دے رہی تھیں شہر کے سب سے بڑے میدان میں ابّا ترنگا لہرا رہے تھے جہاں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور معصوم بچّوں کی چیخ و پکار آزادی کے نعروں میں دب کر رہ گئی تھی۔ کچھ ہی دنوں بعد آزادی، ملک کی خوشی لمحہ بہ لمحہ دن بدن آہ و بکا میں بدلنے لگی تھی۔ ہماری سب کوششیں بے کار ثابت ہو گئی تھیں

چند دنوں میں ہی شہر کے لوگوں نے آنکھیں بدل لی تھیں۔ اور جب ابّا کا قتل ہوا تو میں بے بس ہو گیا تھا۔ جیب میں ملک کے وزیر اعظم کی چھٹی۔ خاندان کی جنگ آزادی کے لئے جد و جہد۔ ابّا کا خلوص ماں کی شہادت بہن کے سینے کی گولی دادی اماں کی دعائیں سب یوں بے کار ہو گئیں تھیں کہ میرا اپنے آپ سے مذہب سے یہاں تک کہ خدا سے اعتقاد اٹھ گیا اور پھر حالات نے مجھے ملک

چھوڑنے پر مجبور کر دیا

میں، میری ۹۵ سالہ بوڑھی دادی میرا لڑکا آفتاب اور میری بیوی یہ چھوٹا سا قافلہ پاکستان کے لئے روانہ ہو گیا۔ رخسانہ پٹنہ میں اپنی پھوپی کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ پٹنہ جانے کے سب راستے بند تھے۔ ہر طرف خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں جن کو تیر کے پار اترنا میرے بس کا نہ تھا۔ اپنے جگر کا ٹکڑا اپنے وطن میں چھوڑ کر ہم چل دیئے اس دیس کی طرف جو ان جانا تھا جو اجنبی تھا ہمارے سب کے لئے۔ ہمارا آبائی گھر چھوٹا سا تھا لیکن کتنی کہانیاں وابستہ تھیں اس کی ہر چوکھٹ سے۔ آنگن سے۔ آنگن میں سہانی چھاؤں والے نیم کے پیڑ سے نیم کے پیڑ کی شاخ سے ڈلے جھولے سے۔ اس دالان سے جہاں ابا ملک کی جنگ آزادی کی کہانیاں کہا کرتے تھے اور ہمیں ملک پر قربان تک ہونے کا سبق پڑھایا کرتے تھے۔ اس کوٹھڑی سے جہاں بوڑھی دادی انگیٹھی جلا کر جہاں پوپلے منہ سے پریوں کے قصے کہتی تھی وہاں ساتھ ساتھ گاندھی جی سے بے پناہ عقیدت کا ذکر یوں کرتیں جیسے وہ گاندھی جی کے ساتھ کھیلی ہوں ساتھ پلی ہوں۔ سفید مہین کھدر کی شلوار قمیض۔ برا ک سا سفید سینا دوری رنگ برف کے گالوں جیسے بال وہ اپنے بچوں کی قربانیاں سن سن کر روتی نہیں تھیں بلکہ خوشی کے دو آنسو بہا دیتی تھیں۔ اسی چوبارہ سے جہاں ہم پہروں بیٹھ کر ملک کی آزادی کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ جہاں سب دوست اکٹھے مل کر بیٹھتے تو ماں قیمے کے پراٹھے پکا کر بھیجتی تو سیاست کی کڑواہٹ منہ سے غائب ہو جاتی

کتنی کہانیاں کتنے افسانے۔ کتنے اپنے کتنے پرائے کتنے سہانے کتنے پیارے سپنوں کو ہم اپنے پیچھے چھوڑے جا رہے تھے۔ اب اس آنگن اور اس گھر سے وابستہ کہانیاں کون کیسے سنائے گا۔ دادی اماں بہت حیران و پریشان تھیں۔

وہ عبدالکریم کے قتل سے بھی زیادہ اس دیار کو چھوڑتے وقت جذباتی ہو گئی تھیں اور جب اس نے مجھ سے کہا عبدالشکور اس وطن کی سرزمین کو میرے خاندان نے اپنے خون سے سینچا ہے۔ اس کی مٹی میں میرا بیٹا دفن ہے اس مکان کے ہر کونے میں تمہاری ماں کے قہقہے بکھرے ہوئے۔ اس کا ذرہ ذرہ رخسانہ کے نغموں سے شرابور ہے۔ اُس نے نیم کے پیڑ پر ڈلے جھولے کی ہر ہلور اس خوابوں کے محل کے اونچے سے اونچے مینار کو چھو لینے کو بیتاب ہے جو رخسانہ پینگ بڑھاتے ہوئے دیکھا کرتی تھی۔ بیٹا شکور ہم اس ملک کو کیا ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینگے ؟۔ اور میرے دل میں ایک ٹیس اٹھی تھی۔ آنکھیں برسات کے بادلوں کی طرح امڈ آئی تھیں۔ ایک چیخ میرے گلے میں اٹک کر رہ گئی تھی اور وہ منظر مجھے زندگی بھر نہیں بھولے گا جب بوڑھی اماں اپنے مکان سے نکلتے وقت دالان کی چوکھٹ سے چمٹ گئی تھی۔ ادھر ہر ہر مہادیو" اور" اللہ اکبر" کے نعرے دل خراش چیخ بن کر گھر کے قریب آرہے تھے۔ کتنی مشکل سے آفتاب نے دادی اماں سے وہ چوکھٹ چھڑ وائی تھی۔ کتنی حسرت سے مکان کو دیکھتے ہوئے دادی نے ڈیوڑھی کی دہلیز پار کی تھی۔ گلی کا موڑ مڑنے تک وہ خاموش پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے گھر کی طرف دیکھتی رہی تھیں جس کی چھت پر ایک میلا سا ترنگا جھنڈا اب بھی لہرا رہا تھا۔ محلے کے بہت سے ہندو ایسے تھے جن کو ابّا کے پیار نے ہی پروان چڑھایا تھا لیکن کوئی بھی الوداع کہنے گھر سے باہر نہیں آیا تھا سوائے مکندلال کے جو انگریزوں کا پٹھو تھا۔ جس کی ابّا سے کبھی نہیں بنی تھی جسے ہم ٹوڈی بچہ کہہ کر چڑایا کرتے تھے۔ ایک وہی تھا جس نے دادی ماں کے پاؤں چھوئے تھے جس نے دادی ماں کے تلووں کی مٹی لے کر اپنے ماتھے پر لگائی تھی اور جو بھیگی بھیگی نظروں سے اس چھوٹے سے قافلے کو اس وقت تک دیکھتا رہا تھا جب تک تانگہ گلی کا موڑ

نہیں مرگیا تھا۔

مشرقی پاکستان میں ایک انجانی دھرتی پر پہنچ کر ایسا محسوس ہوا تھا کہ ہم اپنا جسم تو خیر و عافیت سے لے کر آگئے تھے لیکن ہماری روح بہت پیچھے کہیں رہ گئی تھی وادی دہاں پہنچتے ہی بیمار ہوگئی تھیں اور چند ہی دنوں میں اس راستے کو تکتی ہوئی جاں بحق ہوگئی تھیں جو راستہ ہمیں یہاں پاکستان میں لے آیا تھا۔ بہت بھاگ دوڑ کے بعد ایک مکان الاٹ ہوا لیکن اس میں گھسنے کا حوصلہ بڑی مشکل کے بعد ہوا تھا۔ اس مکان کی بھی ہر چوکھٹ ہر دروازہ ہزاروں لاکھوں کہانیاں اپنے میں سمیٹے ہم نو واردوں کو گھور رہا تھا وہ کہانیاں ہماری سمجھ میں کچھ آرہی تھیں کچھ نہیں کیونکہ شاید کہانی تو وہی تھی لیکن زبان علیحدہ تھی۔ ایک عدد ربڑ کی گڑیا اوندھے منہ ایک کونے میں پڑی تھی اور ایک بستہ جس میں بنگالی قاعدہ تھا ایک سلیٹ تھی جس پر ٹیڑھے میڑھے بنگالی لفظوں میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ میری بیگم نے حوصلہ کر کے اس گڑیا کو اٹھا لیا تھا سینے سے لگا لیا تھا چوما تھا، شاید اسے اپنی رخسانہ یاد آگئی تھی۔ اُس نے وہ بستہ وہ سلیٹ بھی اٹھا کر اپنے صندوق میں رکھ لی تھی۔ اس طرح جیسے وہ کوئی امانت ہو۔ وہ امانت جو کبھی نہ کبھی لوٹانی ضرور پڑے گی۔

مشرقی پاکستان کی سرکار کی مجھ پر بہت کڑی نگرانی تھی۔ میرا ہر خط ہر چٹھی چاہے وہ ہندوستان سے آئی ہو یا پاکستان سے سنسر ہوتی میری ہر حرکت پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی جس سے میری زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی تھی۔ آمدن کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ نوکری اس عمر میں ملنے کا سوال ہی نہ اٹھتا تھا۔ کاروبار میرے بس کا روگ نہ تھا۔ سیاست داں مجھے پاکستان کا دشمن نمبر ایک سمجھتے تھے۔ لاچار آفتاب نے میری بے بسی کو بھانپ کر کتابوں کی دکان کھول لی تھی۔ اور تھوڑی بہت گزربسر ہونے لگی تھی۔ حکام کو میری نیت پر شک تھا حالانکہ میں جی کھول کر ان ظلموں کی

مذمّت کرتا جو ہمارے بھائیوں پر مسلمانوں پر ہندوستان میں ڈھائے جا رہے تھے لیکن حکام کو کسی طرح یقین نہ آتا

جب میں اپنا تجزیہ کرنے بیٹھتا تو مجھے ایسا لگتا کہ میں ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ آخر خالی یادوں کو سینے سے لگائے رکھنے سے حاصل بھی کیا تھا۔ اس ملک اور اس کے لوگوں نے جس کے لئے ہم نے اپنا سب کچھ لٹا دیا میرے ابا کی حفاظت نہ کر سکا۔ جب جب میں اخباروں میں خان عبدالغفار کے بارے میں پڑھتا تو میری سوئی ہوئی رگ پھر پھڑ کنے لگتی لیکن جب ٹھنڈے دماغ سے سوچتا تو محسوس یہی ہوتا کہ اب سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے سے فائدہ بھی کیا۔ ہندوستان سے وابستگی بس اتنی ہی رہ گئی تھی کہ رخسانہ پٹنہ میں تھی اور اس نے کسی ہندو پریس رپورٹر سے شادی کر لی تھی اور کمیونسٹ پارٹی کی سرگرم ممبر تھی۔ اس کی سیاسی سرگرمیوں کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ سیاست کا بیج جو ایک بار کسی آنگن میں بو دیا جائے تو سو بار پودا کاٹنے کے باوجود کہیں نہ کہیں سے پھوٹ ضرور پڑتا ہے۔

میں نے اپنی سیاسی سرگرمیاں تیز کر دیں اور آن کی آن میں حکومت کی نظروں میں پاکستان کا سچا وفادار بن گیا۔ سیاست میری رگ رگ میں تھی۔ ان مسلم لیگی لیڈروں کو پچھاڑنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ جو اس جماعت میں اچھے اچھے عہدوں پر فائز تھے کیونکہ ان کو تو وقتی لہر نے آگے کر دیا تھا۔ انگریزی سرکار کا سہارا تھا ان نوزائیدہ سیاسی لوگوں کو۔ قربانی کی ضرورت نہیں تھی۔ جیل یا پھانسی کا ڈر نہیں تھا۔ ایسے ایسے لوگ اس میں آ شامل ہوئے تھے جن کو سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا صرف وقت کے ریلے نے انہیں وہاں لا کھڑا کیا تھا۔ بعد کے حالات سے واضح ہو گیا کہ کس طرح یہ ریت کی دیوار ڈھ کر رہ گئی تھی۔ ہر لمحہ فوج کا حکومت پر قبضہ کر لینا صاف ظاہر کرتا ہے کہ مسلم لیگ کی جڑیں عوام میں نہیں بلکہ ڈرائنگ

روم میں آویزاں منی پلانٹ کی طرح تھیں جو کچھ دن خوب خوب لہلہاتا ہے ۔ میں اپنے علاقے کا ۔ پھر ضلع کا اور پھر سارے صوبے کا اہم لیڈر بن گیا ۔ حکومت کا بھر دسہ مجھ پر بڑھتا گیا اور وقت گزرتا گیا ۔ آفتاب کی دکان دن دونی رات چوگنی ترقی پر تھی ۔ اب وہ صرف کتب فروش ہی نہیں اچھا خاصا پبلشر بن گیا ۔ باپ کا سیاسی رسوخ بیٹے کی محنت خوب خوب رنگ لائی ۔ اور پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ جب سیاستدان میں خود غرضی پیدا ہو جائے تو وارے نیارے ہونے میں دیر کہاں لگتی ہے ۔ سکول کی درسی کتابوں سے لے کر یونیورسٹی کی سب کتابیں آفتاب کے ہاں سے شائع ہوتیں ۔ مکان کی جگہ بہت بڑے بنگلے نے لے لی تھی ۔ آسائشوں نے ہمارے گھر کا راستہ دیکھ لیا تھا ۔ موٹر سے لے کر سلائی کی مشین تک ۔ فانوس سے لے کر دروازوں کے پردے تک بدیشی تھا اور کیا تھا جو گھر میں نہیں تھا ۔

ابا کے کھدر کے کپڑے اور میری کھدر کی اچکن دکھ بھرے دنوں کی یاد بن کر کھونٹی پر لٹک رہے تھے جنہیں بیگم نہ جانے کیوں جھاڑتی پونچھتی رہتی تھی ۔ حالانکہ میں نے کئی بار اس سے کہا تھا کہ اس نشانی کو بھی ختم کر دو ۔ پرانی دکھ بھری یادوں سے کیا فائدہ ! ہاں کبھی کبھی دادی ماں اب بھی خوابوں میں آ کر پوچھ لیتی ہے ۔ "شکور بیٹا کیا ہم کبھی اپنے گھر اپنے شہر چھپرا نہیں لوٹیں گے" میری آنکھ کھل جاتی ہے اور میں سکاچ وہسکی پینے لگ جاتا ہوں ۔

آفتاب کی بیوی ایک بنگالی باشعور سیاسی خاندان کی لڑکی ہے ۔ اس کا بھائی بہت بڑا انقلابی ہے ۔ صبح سے شام تک آگ اگلتا ہے مذہب سے لے کر خدا کے خلاف حکومت سے لے کر سماج کے پرانے ناسوروں تک نظمیں لکھتا ہے تو ان میں سے بارود کی بو آتی ہے ۔ گیت گاتا ہے نئی صبح کے وہ صبح جس کے ہم بھی کبھی ... گی بھی کہ نہیں

وہ کبھی گھر پر بہن سے ملنے آجاتا ہے تو میرے ساتھ اکثر الجھ پڑتا ہے۔ ہنگامہ کھڑا کر دیتا ہے میں پریشان ہو کر بوکھلا جاتا ہوں اور خدا کی قسم مجھے اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں سوجھتا میں اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہوں اس سے سہمتا ہو جاتا ہوں لیکن گھر کی چار دیواری کے اندر۔ باہر جاتا ہوں تو وہ خود غرضی کا سیاسی بھوت مجھ میں پھر جاگ اٹھتا ہے۔ مجھے ابا کا قتل یاد آجاتا ہے۔ مجھے اپنے شہر کی وہ مڑتی ہوئی گلیاں یاد آجاتی ہیں جن پر میرا اب اتنا بھی حق نہیں کہ کسی دیوار کا سہارا لے کر چند آنسو بہا سکوں جیل کی وہ کوٹھری یاد آجاتی ہے جہاں ابا کی جوانی بھسم ہو گئی تھی۔ میرا لڑکپن، لڑکپن کی شوخیاں سنجیدہ بن کر رہ گئی تھیں۔ میں سٹیج پر ہندوستان کے خلاف زہر اگلتا ہوں جو پاکستان کی فوجی حکومت کو بہت اچھا لگتا ہے۔ تنہائی میں وزیر اعظم ہندوستان کا خط اکثر پڑھتا ہوں۔ اور خود ہی سے سوال کرنے لگتا ہوں کہ یہ کیا کھیل تھا جو ہمارے ساتھ کھیلا گیا۔ یہ کون سا سیاسی داؤ تھا جو ہماری سمجھ میں نہ آسکا تھا۔ ہندوستان کا وزیر اعظم بے بس کیوں تھا۔ گاندھی جی کا قتل کس نے کروایا۔ ڈپٹی کمشنر آزاد ہندوستان میں کیسے ڈپٹی کمشنر بنا رہا وہ کیوں بے بس تھا! پھر دل کو سمجھاتا ہوں شاید اسے جواہرلال کے خط کی بھاشا سمجھ ہی نہ آئی ہو۔

ہاں بات تو چل رہی تھی آفتاب کی بیوی کے بھائی کی۔ ہم سیاسی لوگ بھی بہت جلد بہک جاتے ہیں جذباتی ہو جاتے ہیں۔ وہ انقلابی اپنی نظمیں ہر گلی کے موڑ پر کھڑا ہو کر پڑھنے لگتا ہے۔ کھیتوں میں کھلیانوں میں چوپالوں پر وہ نظمیں سناتا ہے اور کئی بار حکومت نے اسے جیل میں بند کر دیا لیکن وہ جیل میں بھی نظمیں لکھتا پڑھتا رہا۔ اس کی بہن بھی گھر میں اسی کی نظمیں گنگناتی رہتی ہے۔ میں اب کافی زیادہ بنگالی سمجھ لیتا ہوں۔ اور اس کی نظموں کا مطلب بہت کچھ میری سمجھ میں آ جاتا ہے لیکن بنا رہتا ہوں۔ دلہن سے ان کا مطلب

پوچھ بیٹھتا ہوں۔ تو وہ میرے پوتے کے سر پر ہاتھ رکھ دیتی ہے اور صرف یہ کہتی ہے آیا حضور یہ نظمیں، ان کا مطلب آپ کے لئے نہیں اس کے لئے ہے اس کے مستقبل کے لئے ہے۔ آئندہ آنے والی نسل کے لئے ہے اور میں اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہوں۔

۱۹۷۱ء کا جنم ہوتے ہی آفتاب مجیب الرحمٰن کی پارٹی میں شامل ہو گیا۔ اس کی دلچسپی زیادہ سرگرم تھی۔ سیاسی میدان میں ہلچل آگئی۔ باہر زلزلہ تھا گھر میں بھونچال۔ میرے لئے دونوں طرف خطرہ تھا میں اس دباؤ اس بوجھ کو خود بھی برسوں سے محسوس کر رہا تھا جو بنگالی لوگ محسوس کر رہے تھے اور گاہے گاہے میں اس کی خبر فوجی حکمران کو دیتا بھی رہا لیکن اس کا جواب مجھے یہی ملتا ڈٹے رہو۔ یہ بنگالی کتے بھونکنے کے عادی ہیں اور یہ منافقت مجھ میں حلول کر گئی اور میں بھی مجیب الرحمٰن اور اس کی تحریک کو فوجی حکمرانوں کو ایک تنکا بنا کر دکھاتا رہا۔ اپنی سرگرمیوں اپنی گرفت کی داستان کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا رہا۔ اور حکمران کا بھروسہ مجھ پر اور بڑھتا گیا اور بڑھتا گیا لیکن میں میرا وجود میرا ضمیر اور سکڑتا گیا اور سکڑتا گیا۔

پھر ایک دن وہ آیا کہ دنیا کے نقشے پر ایک اور نام نمودار ہوا۔ جیسے کبھی پاکستان کے نام کا اضافہ ہوا تھا۔ "بنگلہ دیش"

نئی حکومت کا پہرہ ایک بار پھر مجھ پر کڑا ہو گیا۔ میری نگرانی کے لئے کئی سی۔ آئی۔ ڈی کے افسر مقرر ہو گئے۔ میری ہر حرکت پر بنگلہ دیش کی حکومت کی نظر رہنے لگی اور مجھے خفیہ وائرلیس جو میری کوٹھی میں نصب تھا حکومت پاکستان کے سربراہ جنرل یحییٰ خاں کا مشورہ موصول ہوا۔ کہ میں کراچی پہنچ جاؤں کیونکہ انہیں پتہ چلا تھا کہ میرے قتل کی سازش بنگلہ دیش میں مکمل ہو چکی تھی اور

حکومت پاکستان میری حفاظت کے لئے سر توڑ کوشش کر رہی ہے۔ ان کا فرمان تھا کہ کل صبح ہونے سے پہلے ایمبولینس مجھے اور میرے خاندان کو لینے آئے گی۔ جو ہم کو ہسپتال کی بجائے امریکی سفارت خانہ پہنچا دے گی اور وہاں سے کسی نہ کسی طریقے سے ہمیں کراچی پہنچا دیا جائے گا۔

ابھی ابھی یہ پیغام میں نے گھر والوں کو بتا دیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آفتاب اور اس کی بیوی اپنا ملک اپنا گھر نہیں چھوڑیں گے۔ ڈلہن میرے ننھے پوتے کو گود میں لئے میرے پاس بیٹھی ہے۔ بیگم بہت نڈھال نظر آرہی ہے۔ آفتاب دلہن کے بھائی کی کتاب کی ورق گردانی کر رہا ہے جو اس کے مطبع سے ابھی ابھی شائع ہوئی ہے۔ لیکن پریشانی اور حیرانی اس کے چہرے سے صاف صاف جھلک رہی ہے۔ میرے دل کی حالت آج پھر ویسی ہی ہے جو ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم ہندوستان کا خط ملنے پر تھی جسے لے کر میں ضلع کے ڈپٹی کمشنر کے پاس گیا تھا۔ جس نے اپنی بے بسی کا اظہار یوں کیا تھا جیسے حکومت برطانیہ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوستان کو آزاد کرنے میں کیا کرتی تھی۔ اسی روز میرے ابا کا قتل ہوا تھا جس نے سب پرانی قدروں کو جو میرے ذہن میں گھر کر چکی تھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ابا کے قتل کا دن میری زندگی ہی نہیں بلکہ مارے خاندان، نہیں بلکہ دو قوموں کے نظریئے کی تھیوری کے لئے ایک موڑ کا دن تھا۔!

ابا جو انگریزوں کے خلاف دہکتی بھٹی میں اپنے بیٹے تک کو جھونکنے کو تیار تھے اپنی بیوی کی لاش کو قوم کے سپرد کر کے کہیں جیل کے تاریک کونے میں دو آنسو بہانے پر رضامند ہو گئے انہیں کیا معلوم کہ کسی خفیہ کارخانے میں کہ ہمارے خاندان کی وفاداری کی گہرائی ناپنے کو خنجر تیار کیا جا رہا تھا

انگریزوں کے خلاف لڑنے کی جرأت ہی یہ تھی کہ وادی والوں کو ان کے آبائی

مکان سے جبری ہجرت اختیار کرنی پڑی تاکہ وہ ایک اجنبی دیس میں صرف چند سانسوں کا اور سودا کر سکیں۔

کل میں اپنا تیسرا گھر بنانے کے لئے کراچی چلا جاؤں گا۔ بیگم میرے بڑھاپے پر ترس کھا کر میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی ہے حالانکہ اس کی آنکھیں بار بار اس ننھے پر اٹھ رہی ہیں جو دُلہن کی گود میں بیٹھا اس کے سونے کے لاکٹ سے کھیل رہا ہے۔ میں نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ یہ مجھے کون سے گناہ کی سزا مل رہی ہے۔ وہ کون سا جرم تھا جس کی پاداش میں مجھے چھپرہ چھوڑنا پڑا تھا یہ کون سا گناہ ہے جو مجھ سے ڈھاکہ میں سرزد ہوا ہے۔ کئی بار سوچتا ہوں کہ میری فکر ناقص ہے یہ سماج غلط ہے۔ آج مجھے دُلہن کا بھائی بہت یاد آ رہا ہے۔ آج اس کی سب نظمیں سلیس زبان بن کر میرے ذہن کے ہر کونے میں یوں بکھر گئی ہیں جیسے ان کا جنم میرے ذہن کی چاردیواری میں ہی ہونا چاہئیے تھا۔

بیگم نے ابا کا کھدر کا کرتہ پاجامہ میری کھدر کی بوسیدہ سی اچکن بیش قیمت چاند ستاروں کے ٹکنوں والی خیردانی تہہ کر کے صندوق میں رکھ لی ہے اور میں ایمبولینس کا انتظار کر رہا ہوں جو مجھے امریکن ایمبیسی لے جائے گی جہاں سے میں اپنا تیسرا گھر بسانے کراچی روانہ ہو جاؤں گا۔

رات کے دو بجے ہیں ایمبولینس ابھی نہیں آئی بیگم کئی بار جا کر اپنے پوتے کو دیکھ آئی ہے جو گہری نیند میں نئی صبح کا خواب دیکھ رہا ہے بیگم آکر رونے لگ جاتی ہے میرا جی بھی چاہتا ہے کہ آفتاب کو گلے سے لگا کر اتنا روؤں اتنا روؤں کہ میرے اس گناہ کی شکل ڈھل کر میرے سامنے آجائے جس کی سزا مجھے بار بار مل رہی ہے۔

"بیگم تم کیا اس بھرے گھر کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہو یہ گھر آفتاب اور اس کی بیوی کا ہے۔ چھپرہ والا گھر دادی ماں اور ابّا کا تھا۔ ہم تو اپنا گھر بنانے جا رہے ہیں سمندر کے کنارے کراچی جو شہر ہمارے آباؤ اجداد میں سے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ اس تیسرے گھر میں نہ ابا کے خون کے چھینٹے ہوں گے نہ ننھے کا شور وہاں سکون ہی سکون ہوگا۔ ایک سناٹا۔ گہرا سناٹا، زندگی بھر کا سناٹا۔

ٹیپ ریکارڈ خاموش ہو گیا تھا۔ ایک دکھ بھری ملائم آواز گہرے سناٹے میں ڈوب گئی تھی۔

ضمنی چناؤ

صدیق جب اٹھا تو شراب کی کڑواہٹ اس کے حلق اور زبان پر اس وقت بھی قائم تھی۔ اس نے انگڑائی لے کر زور سے فرش پر تھوکا لیکن اس کے منہ کا ذائقہ نہیں بدلا۔ اس کا دماغ اس وقت بالکل خالی تھا۔ ہر سوچ سے عاری۔ اگر کچھ خیال تھا تو بس منہ کی کڑواہٹ کا۔ اس نے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیا بیڑی سلگا ہی رہا تھا کہ رحمت بھاگا بھاگا آیا اور لڑکھڑاتی زبان میں بولا۔ "صدیق۔ اے او صدیق۔" وہ بری طرح ہانپ رہا تھا اور سوالیہ اس کے۔ اس کی زبان سے کوئی لفظ بھی نہیں نکل پا رہا تھا۔

"کچھ کہے گا بھی کہ صدیق صدیق چلائے جائے گا" صدیق نے بیڑی کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"وہ۔ وہ عابدہ" رحمت پھر بوکھلا گیا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا عابدہ کو"۔ صدیق بھی گھبرا گیا۔

"وہ۔ تیری عابدہ۔ وزیر بن گئی" رحمت بمشکل یہ بات کہہ پایا۔ رحمت نے تازہ اخبار صدیق کے آگے کر دیا اور ٹین کی ٹوٹی ہوئی کرسی پر جیسے گر گیا۔

صدیق نے اخبار رحمت کے ہاتھ سے لے لیا اور بیڑی کو ہونٹوں کے بجائے

دانتوں میں پکڑ کر چبانے لگا اور آہستہ آہستہ ساری بیڑی چبا گیا اور پھر زمین پر زور سے تھوکتے ہوئے چار پائی پر بیٹھتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ اخبار اس کے ہاتھوں میں چرمر ہو گیا جیسے وہ اخبار کو نہیں اپنے حالات کو توڑ مروڑ رہا ہو۔ وہ بہت دیر تک چپ چاپ خالی الذہن بیٹھا رہا۔ شاید ابھی کچھ دیر اور وہ اسی حالت میں رہتا لیکن نبی بخش حلوائی، جما ہوٹل والا۔ پیلا د درزی۔ فضلو کا نا رحیم خان پٹھان اور نہ جانے کون کون لوگ بازار سے صدیق کے مکان والی تنگ گلی میں آ گھسے "مبارک باد" کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی آوازیں سنائی دی تھیں۔

"اب تو صدیق کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔" "اب دیکھنا صدیق کے ٹھاٹ" کوئی کہتا "سالا سارا دن تانگہ چلاتا تھا اب کاروں میں گھومے گا" آنے والوں میں سے ایک نے کہا "دن پھر گئے اس کے۔ لڑکی بھی پھانسی تو گیا" غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں لیکن صدیق چپ تھا وہ یہ سب کچھ ان سنا کر رہا تھا۔ جیسے یہ خبر خوشی کی نہ ہو بلکہ کسی رشتے دار کی موت کی خبر ہو۔

آخر سب لوگ صدیق کا بگڑا ہوا موڈ دیکھ کر کھسک گئے۔ بس ایک رحمت رہ گیا تھا۔ صدیق نے اپنی پھٹی ہوئی دری کے نیچے سے چار روپے نکال کر رحمت کو دیئے اور رحمت بغیر کچھ کہے سنے اٹھ کر چلا گیا ....

.... وہ صدیق کی بات سمجھ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ صدیق جب خراب موڈ میں ہوتا ہے تو چار روپے نکال کر دینے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ وہ صدیق کا پرانا اور راز دار دوست تھا۔ جب عابدہ صدیق سے ملنے آتی تو وہ گھنٹوں گلی میں پہرا دیا کرتا تھا حالانکہ اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں ہوا کرتی تھی۔ وہ رات گئے عابدہ کو گھر چھوڑنے بھی جاتا۔ کئی بار نشے کی حالت میں وہ عابدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بھی چلا تھا لیکن عابدہ سے اس نے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہ کی تھی۔ جس کی شکایت

صدیق تک پہنچتی۔ وہ جانتا تھا کہ عابدہ صدیق کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ عابدہ اپنے اپاہج بھائی اور بوڑھے بیمار باپ کے لئے پیشہ کرواتی ہے لیکن پیار، پیار ہوتا ہے دوست، دوست اور امانت امانت۔

کئی بار کاریں عابدہ کو لینے یا چھوڑنے آتی تھیں لیکن عابدہ بغیر صدیق کو ملے کبھی اپنے گھر نہیں گئی۔ ہاں کبھی یہ ضرور کہہ دیتی "صدیق۔ آج نہیں۔ آج میرا انگ انگ جھنجوڑ دیا تھا ظالم نے۔"

عابدہ حسین نہیں بہت حسین تھی۔ اس کا اندازہ وہی لگا سکتا تھا جس نے اسے قریب سے دیکھا ہو۔ دور سے وہ برف کی گڑیا نظر آتی تھی لیکن قریب سے دیکھنے پر وہ ایک خوبصورت رنگین تصویر لگتی تھی جس میں ملاحت کی لہروں کا مدجزر تھا۔ گلابی ہونٹ۔ نشیلی سرمئی آنکھیں، سنہری بال۔ جسم کا لوچ جیسے وہ کوئی الوراکا بت ہو۔ آواز میں مٹھاس کی حد تک نرمی۔ کئی بار تو لوگ اس کے بارے میں یہاں تک کہہ دیتے "وہ کوئی دیوی ہے جسے دنیا کے ذلیل لوگ اپنی ہوس پوری کرنے کے لئے کسی مندر سے اٹھا لائے ہیں۔"

عابدہ نے یہ دھندہ کب شروع کیا اس کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں۔" وہ کالج میں پڑھا کرتی تھی اور اس کے باپ کا بہت بڑا کاروبار تھا پھر یکایک کسی وجہ سے اس کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ اس کا باپ تپ دق سے بیمار پڑ گیا۔ حالات بگڑے تو اس کی پڑھائی بھی چھٹی اور نوبت یہاں تک آ گئی تھی" کوئی کہتا "عابدہ کو کالج میں کسی ہندو لڑکے سے عشق تھا لڑکے کے ماں باپ نے شادی سے انکار کیا تو لڑکے نے خودکشی کر لی اور پھر وہ اپنے بس میں نہیں رہی تھی۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ صدیق نے اسے خراب کیا ہے۔ وہ اسے گھر سے کالج اور کالج سے گھر اپنے تانگہ

میں لے جایا کرتا تھا" کئی لوگ عابدہ کی ماں پر بھی اوباش ہونے کی تہمت لگاتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کی صحبت میں بگڑ گئی تھی۔ اس میں کون سی بات سچی تھی کون سی جھوٹی یہ عابدہ ہی جانتی ہے اور کوئی نہیں۔

صدیق امیر خاندان کا ایک بگڑا ہوا نوجوان تھا جس نے ورزش اور عیاشی کے سوا شاید ہی کوئی کام کیا ہو۔ اس کے دوسرے بھائی اچھے اچھے عہدوں پر لگے تھے۔ باپ لاکھوں کی جائیداد چھوڑ گیا تھا لیکن صدیق کے ہاتھ اس جائیداد میں سے سوائے اس کمرے کے جس میں وہ رہتا تھا اور کچھ بھی نہیں لگا تھا۔ اس کی وجہ اس کی سوتیلی ماں تھی۔ پھر ایک چھوٹے بھائی نے اسے ایک ٹانگہ اور ایک گھوڑا لے دیا اور جب وہ گھوڑے کے بدن پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو جاتا تو ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے وہ کوئی نواب ہو۔

صدیق کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا لیکن سیاست سے سمگلنگ تک ہر ایک موضوع پر اپنی رائے رکھتا تھا۔ وہ لیڈر تو نہیں تھا لیکن محلے کا ہر جھگڑا اس کے بغیر طے نہ ہو پاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ محلے کے بگڑے ہوئے چھوکرے بھی اس کے کمرے کے آگے سے کان دبا کر نکلتے۔ شہر کا اچھے سے اچھا پہلوان صدیق کو سلام کئے بغیر نہ جاتا۔ اس کے محلے میں کوئی اکڑ کر چلنے کی ہمت نہیں کرتا تھا چاہے وہ کریم اللہ رئیس ہی کیوں نہ ہو۔

عابدہ صدیق کے پاس بغیر پردہ کئے آتی۔ رات رات بھر وہ صدیق کے کمرے میں بیٹھی رہتی۔ لیکن کسی میں ہمت نہ تھی کہ کھانس کر یا آنکھ اٹھا کر ادھر سے گزر جائے۔ عابدہ نے کئی بار کریم اللہ کے ساتھ ہوٹل میں رات گزاری تھی۔ لیکن محلے میں کریم اللہ کی جرأت نہ تھی کہ آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لے کہ عابدہ صدیق کی چارپائی پر کس انداز سے لیٹی ہے۔

رحمت کے جانے کے بعد صدیق نے اپنا ٹرنک کھولا۔ عابدہ کی تصویریں نکالیں جو ہر زاویئے سے کھنچی ہوئی تھیں۔ کبھی صدیق کی گود میں۔ کبھی باہوں میں۔ کبھی صدیق کے سینے پر سر رکھے ہوئے۔ صدیق کو شراب پلاتے ہوئے۔ انگڑائی لیتے ہوئے۔ کہیں بکھرا سا جسم۔ کہیں مستی میں جھکی جھکی آنکھیں کہیں اٹھائوں سے ہٹا ہوا بلاؤز ——

صدیق نے تصویروں کو ڈھانپ دیا۔ جیسے وہ کسی ناگن کی تصویریں ہوں —— اس کا دماغ اب خالی تھا —— بالکل خالی۔

وہ پھر بیڑی سلگا کر بیٹھ گیا۔ گلی کے نکڑ پر سے رحمت کو آتا دیکھ کر اس نے ایک گلاس پانی کا اور پیا اور پھر بیڑی پینے لگا۔ رحمت نے بغیر کچھ کہے شراب کا پوا صدیق کے سامنے رکھ دیا اور صدیق نے چپ چاپ سارے کا سارا پوا گلاس میں انڈیل لیا اور ایک ہی گھونٹ میں پی گیا۔

"ہاں" وہ بہت زور سے گرجا —" رحمت —— تو عابدہ وزیر بن گئی۔ وہ اب میرے کام سے گئی۔

"نہیں صدیق وہ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی" رحمت نے کہا

مجھے معلوم ہے رحمت وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی لیکن اسے میرے بغیر زندہ رہنا سکھا دیا جائے گا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے جب اس نے الیکشن میں کھڑا ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ ایک رات سیٹھ شمبھو دیال کے ہاں کاٹ کر آئی تھی۔ وہ کتنی خوش تھی۔ رات بھر شمبھو دیال نے سوائے اس کے حسن کی تعریف کے کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ عابدہ خود بتا رہی تھی۔ دوسرے دن شمبھو دیال میرے پاس آیا تھا اور دس ہزار روپے میرے آگے ڈھیری کر دیئے تھے۔ وہ تھا بہت استاد۔ روپے دے کر اس نے کہا۔ عابدہ تمہیں بہت

چاہتی ہے۔ تم پر جان چھڑکتی ہے۔ وہ کوئی قدم بھی تمہاری اجازت کے بغیر نہیں اٹھانا چاہتی اور اگر وہ الیکشن لڑے تو کیا ہرج ہے۔ معاف کرنا صدیق صاحب تمہاری دوست اگر ایم ایل اے بن بھی جاتی ہے تو۔ (ایک آنکھ بند کر کے) کھلائے گی تو تمہاری ہی۔" آخر وہ روپے چھوڑ کر عابدہ کے چناؤ میں پوری پوری مدد کا وعدہ لے کر ہی گیا تھا۔ رحمت بھائی تجھے معلوم ہی ہے کہ اس کے بعد میں نے نہ دن دیکھا نہ رات۔ شمبھو دیال کا روپیہ ہماری ہمت۔ خریدے ہوئے آدمیوں کا ہنگامہ اور اس روز تو چناؤ کا پانسہ ہی پلٹ گیا تھا جب بہت بھاری جلسے میں سیٹھ شمبھو دیال نے جھوٹوں ہی کہا تھا "کیا آپ اس بہادر خاندان کی لڑکی کو ووٹ نہیں دیں گے جس کے ننیہال کے گاندھی جی سے گہرے تعلقات تھے۔ گاندھی جی نے خود اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی چادر عابدہ صاحبہ کی ماں کی موت پر بطور کفن بھیجی تھی۔ یہ اس خاندان کا چراغ ہے جس سے ہندوستانی نیشنلسٹ مسلمانوں کا سر اونچا ہو جاتا ہے۔ یہ وہ جیتی جاگتی دیوی کا روپ ہے جس کا انگ انگ جسم کا رواں رواں اپنی قوم۔ اپنے ہم وطنوں کے کام آتا رہے گا۔" پھر پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔

"میں اور کریم اللہ حیران و ششدر جلسے میں شمبھو دیال کی تقریر سن رہے تھے۔ یہ کتنا خوبصورت جھوٹ تھا جسے سینکڑوں نہیں ہزاروں آدمی سچ مان گئے تھے۔"

پھر عابدہ ایم۔ ایل۔ اے بن گئی۔ اس کا صدیق کے پاس آنا جانا پھر بھی جاری رہا۔ لیکن اب وہ ہفتہ پندرہ دن میں ایک بار آتی تھی اور پھر آہستہ آہستہ یہ وقفہ مہینے تک پہنچ گیا اور پھر مہینوں میں بدل گیا تھا۔

"اب وہ نہیں آئے گی رحمت۔ اب وہ نہیں آئے گی۔" اس نے انتہائی مایوسی کے ساتھ کہا۔

گلی کے نکڑ پر شمبھو دیال کی کار کو دیکھ کر صدیق چپ گیا تھا اور چارپائی پر سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ رحمت نے کرسی خالی کر دی اور باہر چلا گیا۔

"مبارک ہو صدیق بھائی"۔ شمبھو دیال نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ ہی کو مبارک ہے سیٹھ جی" صدیق نے بمشکل کہا۔

"بھئی مجھے مبارک کاہے کی۔ یار تمہاری ہے"۔ سیٹھ نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے سیٹھ جی۔ کیسی ہے وہ۔ بہت دنوں سے ادھر آنا ہی نہیں ہوا اس کا"

"بہت مشغول رہتی ہے۔ بہت کام آپڑا ہے اس کے سر پر۔ صبح سے شام تک ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ پچھلے دنوں تو میرا بھی اٹھنا بیٹھنا دشوار ہو گیا تھا۔ بہت دوڑ دھوپ رہی ہے۔ اب کچھ چین آیا ہے۔ کوٹھی بھی اسے مل گئی ہے۔ کمپنی باغ کے ساتھ دو منزلہ کوٹھی ہے ___ اب میں بھی سکھ کی نیند سو سکوں گا ___ ہاں تو صدیق بھائی اب کوئی کام ہو بتلا دینا۔ کوئی پرمٹ ___ کوئی لائسنس ___ میں عابدہ سے کہہ دوں گا"

صدیق کو یہ بات بہت عجیب سی لگی ___ وہ کہہ دے گا ___ میرے لئے ___ عابدہ سے ___ وہ کچھ سوچنے لگا۔ اور اس کی مٹھی بند ہو گئی۔ ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹنے لگا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا ___ چہرہ [illegible] لال ہو گیا ___ لیکن پھر اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ کچھ سوچ کر اس کی حالت اعتدال پر آ گئی۔

"ہاں سیٹھ جی ضرورت ہوئی تو آپ سے ضرور کہوں گا۔" صدیق نے تھوک حلق سے نیچے اتارتے ہوئے کہا۔

"ہاں صدیق بھائی گھر ہی کا معاملہ سمجھو — آپ کا نہیں تو اور کس کا کام ہوگا — میں ادھر سے جا رہا تھا سوچا صدیق بھائی سے ملتا چلوں — صدیق بھائی برا نہ مانیں — تو ایک بات کہوں" سیٹھ شمبھو دیال نے متانت سے کہا

"کہئے کہئے سیٹھ جی اس میں بُرا ماننے کی کون سی بات ہے بے دریغ کہئے۔" صدیق نے لاپرواہی سے کہا۔

"صدیق بھائی ایک بار پھر عرض کر دوں — برا نہیں ماننا — یہ میں اپنی طرف سے نہیں۔ عابدہ جی کی طرف سے کہہ رہا ہوں۔ ناراض نہ ہوئیے گا۔ عابدہ جی کی کچھ تصویریں ہیں آپ کے پاس — وہ منگوائی ہیں انہوں نے۔ کہتی تھیں یہ فرق تو کچھ نہیں — میرے پاس ہوئیں یا صدیق صاحب کے۔ مگر صدیق صاحب کا گھر تو سارا دن کھلا رہتا ہے۔ کہیں ادھر ادھر ہو گئیں تو مشکل ہو جائے گی۔ اور آپ صدیق صاحب ان کی پوزیشن کو تو بخوبی سمجھتے ہیں۔" سیٹھ نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"نکل جاؤ یہاں سے سیٹھ۔ پیشتر اس کے میرے ہاتھ اٹھ جائیں۔ تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" صدیق کے ہونٹ پھر کانپنے لگے۔ اس کی آنکھوں میں خون کی سُرخی دوڑ گئی۔ اس کی مٹھیاں پھر بھنچ گئیں اس کی آواز کی گرج سن کر آڑوس پڑوس کے کئی آدمی گھروں سے باہر نکل آئے۔ رحمت جو دروازے کے پاس کھڑا تھا جھٹ اندر آ گیا تھا۔ بڑی مضبوطی سے اس نے صدیق کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

"جانے دو صدیق — خدا کے لئے چپ ہو جاؤ — یہ کیا تماشا بنا رہے ہو؟" رحمت نے بھی اتنی ہی بلند آواز سے کہا جتنی اونچی آواز سے صدیق بول رہا تھا۔

سیٹھ کھسیانا ہو کر چلا گیا —

صدیق کو اپنے حالات معمول پر لانے کے لئے کئی گھنٹے لگے۔ شراب کی کئی بوتلیں

خالی ہو کر ادھر ادھر لڑھک گئیں۔ رحمت۔ صدیق کے سر پر گیلے پانی کی پٹیاں رکھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ زیادہ شراب پینے کے بعد اس کو اعتدال پر لانے کا یہی ایک ڈھنگ تھا۔ رات گئے تک رحمت گیلے پانی کی پٹیاں صدیق کے سر اور ماتھے پر رکھتا رہا اور رات بھر صدیق نشے میں بڑبڑاتا رہا۔

صبح ہوئی تو صدیق کا منہ پھر رات کی شراب کی وجہ سے کڑوا تھا۔ اس نے پھر زور سے زمین پر تھوکا۔ لیکن شراب کی کڑواہٹ منہ سے نہیں جا رہی تھی۔ اس نے دو گلاس ٹھنڈے پانی کے پیئے۔ رحمت سے چائے منگوائی اور پھر رحمت کو جانے کے لئے کہہ دیا تھا۔ وہ چائے کا گھونٹ بھر کر ذرا سا مسکرایا۔ اسے عابدہ یاد آگئی۔ عابدہ جس رات اس کے ساتھ رہتی تھی صدیق صبح اٹھ کر خود چائے بنایا کرتا تھا۔ جب عابدہ پیالی میں سے گھونٹ بھر کر کہتی "صدیق یہ تو بالکل پھیکی ہے۔ اور پیالی صدیق کے ہونٹوں کی طرف بڑھا دیتی صدیق اس میں سے گھونٹ بھرتا تو عابدہ کھلکھلا کر ہنس دیتی۔ صدیق کو ایسا لگتا تھا جیسے آواز اس کے کانوں میں نہیں روح میں رس گھول رہی ہو۔ ایسا ایک بار نہیں کئی بار ہو چکا تھا۔ اور جب کبھی صدیق کہتا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو" تو وہ خدا سے لے کر صدیق کی محبت کی قسم کھا کر اسے چائے چکھنے پر مجبور کرتی تھی۔ اس کے بعد وہی قہقہے۔ وہی نقرئی گھنٹیوں کی جھنجھناہٹ اور پھر وہی صدیق کی دست درازیاں اور جب وہ عابدہ کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ دے کر اس کے چہرے کو اوپر اٹھاتا اور عابدہ کی گہری نیلی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا تھا تو عابدہ کہتی " صدیق۔ جانے تم میں کیا جادو ہے تمہارے بغیر تو شاید زندگی میں کچھ بھی نہیں۔ تمہارے بھرے بھرے ہاتھ۔ تمہارا کشادہ سینہ۔ جو سکون یہاں ہے۔ وہ اور کہیں بھی نہیں۔ میں تو دنیا کے سب دکھوں سے نظر بچا کر تمہاری باہوں میں پناہ لینے آجاتی ہوں۔

ساری رات کا مسلا ہوا جسم تمہارے لمس سے پھر تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ میرے جسم کو رات بھر کے لئے خریدنے والے مجھ سے کیا کیا کرتے ہیں مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کچھ سنائی نہیں دیتا وہ میرے جسم سے کیا کرتے ہیں مجھے احساس تک نہیں ہوتا۔ میں ایک بت کی طرح سہمی سمٹائی بے جان سی ہو کر لیٹی رہتی ہوں۔ کئی منچلے میری اس مردنی کو بھانپ بھی جاتے ہیں۔ لیکن ان کا کوئی بول۔ لمس۔ پیار اس عورت کو بیدار نہیں کر سکتا جو مجھ میں چھپی بیٹھی ہے۔ لیکن جو تمہارے پاس آتے ہی انگڑائی لے کر جاگ اٹھتی ہے میں خود حیران رہ جاتی ہوں۔ پھر میرا انگ انگ جھومنے لگتا ہے۔ ناچنے لگتا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میری جوانی جاگ اٹھی ہے اور پھر میں جب تمہاری باہوں میں جھولی جھول جاتی ہوتی تو ساون کی گھٹاؤں کے پس منظر میں بڑھتی ہوئی پینگوں کی ہلوریں یاد آجاتی ہیں۔" صدیق یہ سن کر عابدہ کو بازوؤں میں اٹھا لیتا۔ چائے ختم ہو چکی تھی اور اسے عابدہ بہت یاد آئی۔ اس نے بازو پھیلا کر آنکھیں بند کر لیں اور وہ سوچنے لگا کہ ابھی ابھی ایک سلگتا سا بدن اس کی باہوں میں آجائے گا اور وہ پھر نیلی نیلی سمندر کی طرح گہری آنکھوں میں ڈوب جائے گا۔

اُس نے آنکھیں کھولیں تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ عابدہ بھی نہیں تھی عابدہ کا جسم بھی نہیں تھا نیلی نیلی آنکھیں بھی نہیں تھیں اسے محسوس ہوا کہ وہ پاگل ہو جائے گا۔ اس نے عابدہ کی تصویریں اٹھائیں ایک ایک کو غور سے اس نے پہروں دیکھا۔ بھیگی بھیگی آنکھیں ساون کی بدلی کی طرح برس پڑیں — پھر اس نے ان تصویروں کو ایک لفافہ میں ڈالا۔ کپڑے تبدیل کئے اور گھوڑے کو کھول کر تانگے میں جوتا اور لفافہ ہاتھ میں لے کر یادوں میں کھویا کھویا شہر کی سڑکوں سے ہو کر وہ کمپنی باغ کی طرف چل پڑا۔ آج گھوڑے کے ٹاپوں میں وہ سُر تال نہ تھا جس کے لئے اس کا

گھوڑا شہر بھر میں مشہور تھا۔ صدیق کو گھوڑے کے بے ڈھب پڑتے ہوئے پاؤں پر بہت غصہ آرہا تھا۔ آج اس کے گھوڑے کی چال میں مستی کیوں نہیں تھی۔ ایک مردہ سا جانور ایک لاش کو کھینچے لئے جارہا تھا۔ اسے برسات کی بھیگی ہواؤں کا بھی مطلق احساس نہ تھا۔ کب اس کا گھوڑا کمپنی باغ کے قریب کی دو منزلہ عمارت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اسے کچھ پتہ نہ چلا۔ پھر اس کی نظر کوٹھی پر پڑی۔ ایک خوبصورت برف کی گڑیا شیشے کے دروازے کے اس پار کھڑی تھی۔ اس نے کوٹھی کے باہر ہی تانگہ کھڑا کر دیا تھا اور لفافہ ہاتھ میں لے کر کوٹھی کے گیٹ پر پہنچا

"کون ہو ۔ کس سے ملنا ہے" دربان نے پوچھا۔

"میں عابدہ سے ملنا چاہتا ہوں" اُس نے ذرا ترشی سے کہا۔

"بڑے بدتمیز ہو بولنے کا ڈھنگ بھی نہیں"

صدیق نے شاید وہ الفاظ نہیں سُنے تھے ۔ وہ کوٹھی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں عابدہ شیشے کے دروازے کے پیچھے کھڑی ٹیلی فون کر رہی تھی۔

"تم نے عابدہ صاحبہ سے ملنے کا وقت لے رکھا ہے" دربان نے کہا۔

صدیق خاموش تھا وہ اب بھی عابدہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ جو اب بھی ٹیلیفون میں مگن تھی۔

ایک جیپ صدیق کے پاس آکر رکی۔ جس میں شمبھو دیال اور پولیس کے آدمی سوار تھے۔ شمبھو دیال نے جلدی سے لفافہ صدیق کے ہاتھ سے چھین لیا۔ صدیق تدر سے سنبھلا اور اس نے سیٹھ کی کلائی اتنے زور سے پکڑی کہ وہ بلبلا اٹھا۔ مگر پولیس والوں نے صدیق کو پکڑ لیا

صدیق پر ننگی تصویریں اور ان کا کاروبار کرنے کے الزام میں مقدمہ دائر

ہو گیا۔ عدالت کی میز پر کتنی ہی لڑکیوں کی برہنہ تصویریں بکھری پڑی تھیں جو پولیس کے کہنے کے مطابق صدیق سے برآمد ہوئی تھیں۔ صدیق ان تصویروں میں سے اس لڑکی کی کھوج میں تھا جس کے بال سنہری تھے۔ جس کی نیلی نیلی جھیل کی طرح گہری آنکھیں تھیں۔ جس کی ٹھوڑی کے پاس ایک تل تھا۔ لیکن ان میں کوئی بھی لڑکی ایسی نہ تھی

چار سال قید بہ مشقّت ۔۔۔ صدیق نے شاید یہ الفاظ نہیں سُنے۔ وہ اب بھی اپنے ذہن میں اس لڑکی کو تلاش کر رہا تھا جس کے بال سُنہری اور آنکھیں آسمان کی طرح نیلی نیلی تھیں

یہ فاصلے یہ دُوریاں

ریڈیو پر یوں تو اچھے ڈرامے بہت کم آتے ہیں لیکن ۱۸ فروری کا ڈرامہ کچھ اتنا دلکش اور مسحور کن تھا کہ ہم میاں بیوی کو یہ معلوم ہی نہ ہوا کہ ہمارے پاس دھرا دودھ کا گلاس بلّی نے کب گرا دیا۔ چھناکے کی آواز اور دودھ کا بکھرنا بھی ہمیں زیادہ دیر اپنی طرف متوجہ نہ رکھ سکا۔ ڈرامے کا کلائمکس قریب تھا کہ اچانک دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ سارا مزا کرکرا ہو گیا اور یہ سوچ کر کہ پتا جی ہوں گے میں فوراً دروازہ کھولنے کے لئے دوڑا۔ میرے پتا جی کافی سخت مزاج آدمی ہیں اور دروازہ کھولنے میں ذرا سی تاخیر بھی —— میں نے کھٹ سے دروازہ کھولا لیکن یہ کون ہے؟ —— ایک گرد و غبار سے اٹے کپڑوں میں ہٹا کٹا نوجوان —— داڑھی بڑھی ہوئی۔ بڑی بڑی روئی روئی سی آنکھیں۔ کپکپاتے ہونٹ۔ گھبراہٹ اور ٹھنڈ سے سکڑتا ہوا بدن۔ اس کے دل کی دھڑکن صاف صاف سنائی دے رہی تھی۔ ہاتھ میں میلی سی پوٹلی۔ پاؤں میں ٹوٹی چپل۔ روکھے سوکھے گھنگھریالے اور گرد آلود بال۔

"کہئیے۔" میں نے تھوک کو گلے میں اتارتے ہوئے کہا

"مجھے بابو پریم کرشن سے ملنا ہے" اُس نے دھیمے سے کہا۔

"وہ گھر پر نہیں ہیں" میرے لہجے میں رکھائی سی تھی۔

"کہاں گئے ہیں؟ کب لوٹیں گے؟" اس نے اٹکتے اٹکتے کہا۔

"کیا کام ہے آپ کو ان سے" میں نے سوچا کوئی اپنا دکھڑا لے کر آیا ہو گا کیونکہ اکثر ایسے فریادی پتاجی کے پاس آتے ہی رہتے ہیں۔

"مجھے ــــ" وہ کچھ اور بول نہ سکا شاید وہ کھڑا ابھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے چوکھٹ کا سہارا لے کر آنکھیں اوپر اٹھائیں تو وہ آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ لیکن مجھ پر اس کے آنسوؤں کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ "دیکھئے آپ صبح آئیے۔ پتاجی گھر پر نہیں ہیں اور اتنی رات گئے وہ کسی سے ملنا پسند بھی نہیں کرتے" میں نے پھر رکھائی سے کہا

"لیکن۔ مجھے ان سے آج ہی بلکہ ابھی ملنا ہے۔ میں ــ میں پچھلے تین دن سے" وہ آگے کچھ نہیں کہہ پایا اب آنسو اس کی آنکھوں سے اس کے گالوں پر ڈھلک آئے تھے اور ایک گدلی سی لکیر بناتے ہوئے اس کی بڑھی ہوئی داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔

اتنے میں میری بیوی میرا انتظار کرتے کرتے ہمارے پاس آ گئی۔ شاید اس نے یہ سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ اس نے کہا "آپ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھائیے پتاجی آنے ہی والے ہیں"

اس نے بھیگی آنکھوں سے میری بیوی کی طرف دیکھا اب اس کے آنسوؤں میں شکریے کا رنگ بھی گھل مل گیا تھا۔

مجھے بیوی کے کہنے پر اپنی اس حرکت پر شرم محسوس ہوئی۔ میں اس کے لئے ٹال مٹول کیوں کرتا رہا کیونکہ اس کے کپڑے میلے کچیلے تھے۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور وہ اس حال میں شریف آدمی نہیں لگتا تھا۔

میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا ـــ وہ ہر چیز کو اس نظر سے دیکھ

رہا تھا جیسے وہ ہمارے گھر میں نہیں بلکہ کسی عجائب گھر میں آ گیا ہو۔ پھر اس نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور کچھ دیر اپنی آنکھوں پر دونوں ہتھیلیاں رکھ کر لمبے لمبے سانس لئے اور آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر اندر ذرا مسکراتے .... ہوئے بولا۔ "چچا کب آئیں گے"

یہ الفاظ سن کر میں اپنے برتاؤ پر دل ہی دل میں اور شرمندہ ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ کہیں ہمارا کوئی دور کا رشتہ دار ہی نہ ہو "بس آیا ہی چاہتے ہیں" اور دروازے کی گھنٹی بج اٹھی "پتاجی آ گئے" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے دروازہ کھولا "آپ سے کوئی ملنے آیا ہے" میں نے پتاجی کو دیکھ کر کہا۔

انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا پھر میری طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

"میں انہیں جانتا نہیں — پہلے کبھی نہیں دیکھا" میں نے کہا۔

پتاجی ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچ کر ٹھٹھکے۔ آنے والے نے کرسی سے اٹھ کر اپنے دونوں بازو یوں پھیلا دیئے۔ جیسے کوئی کھویا ہوا بلکتا ہوا بچہ اپنی ماں کو دیکھ کر — لیکن اس کے قدم آگے نہ بڑھ سکے اور پھیلے ہوئے بازو ڈھیلے پڑ گئے۔ ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

"میں نے تمہیں پہچانا نہیں بیٹا لیکن ایسا لگتا ہے جیسے میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔" پتاجی نے عینک صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میں — میں ارشد ہوں —" وہ یہ بمشکل کہہ پایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"ارشد — کون ارشد —" پھر وہ یادوں کی وادیوں میں کھو گئے۔

"میں — میں ارشد — آپ کا بھتیجا — خورشید احمد کا بیٹا — آپ

کے بھائی کا بیٹا — آپ کا بھائی — جو پاکستان —"

اور پھر پتاجی اس کے ساتھ لپٹ ہی تو گئے۔ آنسوؤں کی گنگا جمنا ہی تو بہہ اٹھی۔ پتاجی کے آنسو ارشد کے چہرے پر جمی گرد کو دھو رہے تھے۔ وہ گرد جو برسوں کی مسافت طے کر کے یہاں پہنچی تھی۔ بہت دیر تک ارشد پتاجی کے سینے سے لگا روتا رہا۔ بہت دیر تک پتاجی آنسو بہاتے رہے میری بیوی اس ملن پر حیران تھی۔ اس نے پتاجی کو اس قدر جذباتی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پتاجی کی آنکھوں میں اتنے آنسو کہاں اور کب سے چھپے ہوئے تھے اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

" ارشد تم کب آئے۔ اتنی بھیانک جنگ کے بعد۔ ہر طرف کڑے پہرے۔ آنے جانے کے سبھی راستے بند؟"

" میں — میں چچا جانی۔ جنگی قیدی ہوں" وہ یہ کہہ کر تھوڑی دیر چپ رہا۔ " میں چلتی گاڑی میں سے جو ہم قیدیوں کو لے جا رہی تھی کود پڑا تھا" اس نے ادھر ادھر دیکھ کر بہت آہستہ سے کہا۔

پتاجی کتنے ہوشیار آدمی ہیں یہ مجھے اس وقت پتہ چلا جب ارشد کی بات سُن کر وہ ایک دم مسکرا دیئے اور فوراً ہی خورشید کے بارے میں پوچھنے لگے " اب تو بوڑھا ہو گیا ہو گا تمہارا باپ — ہے نا؟"

" آپ ہی کی طرح جوان دکھائی دیتے ہیں ابا" ارشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" خدا قسم مزا آ گیا تمہارے جواب کا" پتاجی نے سامنے لگے آئینہ میں جھانکتے ہوئے اور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا " تو بالکل اپنے باپ پر ہے کمبخت وہ بھی اسی طرح ہنسا ہنسا دیا کرتا تھا۔

پدما میری بیوی چائے لے آئی تھی۔ ارشد چائے کے ساتھ کسی اور چیز

کی تلاش میں تھا۔ وہ ...... کئی دنوں سے بھوکا جان پڑتا تھا اور یہ بات پدما بھی فوراً بھانپ گئی اور فوراً ہی میز پر چائے رکھ کر وہ کچھ لینے اندر چلی گئی۔

پتاجی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ تمہارا بھائی ہے۔ اور یہ تمہاری بھاوج" پدما کی طرف دیکھ کر پتاجی بولے جواب بہت سی پلیٹیں اٹھائے لوٹ آئی تھی

پدما نے پلیٹیں میز پر رکھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے نمستے کی تو پتاجی قہقہہ مار کر بول اٹھے "ارے بیٹا آداب بجالاؤ آداب یہ پاکستانی نمستے کو کیا جانیں"

"کیوں چچا جان ہم کیوں نہیں جانتے۔ بارہا ہم گھر پہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر ہندوستانیوں کا مذاق اُڑایا کرتے ہیں"

پتاجی پھر اس زور سے ہنس دیئے کہ میز پر پڑی چائے کی پیالی بج اٹھی

"آپ تو اللہ قسم بالکل ابا کی طرح ہنستے ہیں"

"ارے وہی کمبخت تو مجھے بھرپور ہنسنا سکھا گیا تھا۔ ایک بار مجھے کے ڈرامے میں ہیرو کا رول ملا تھا" پتاجی نے تفخرانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس کا آخری سین تھا" پتاجی اٹھ کر کھڑے ہو گئے "دیکھو یہ کٹہرہ ہے" انھوں نے کرسی کے پیچھے ہو کر کہا "وہ جج بیٹھا ہے" انھوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ویل تم نے چیک پر تین پونڈ کی بجائے تیرہ پونڈ لکھا" پتاجی ناک کے نیچے عینک لاتے ہوئے اور جج کی ہوبہو نقل کرتے ہوئے بولے

"جی ہاں" پتاجی نے مجرم کی طرح بولتے ہوئے کہا

"مگر کیوں" جج کی طرح گرجتے ہوئے پتاجی نے کہا

"میں کچھ کہنا چاہتا ہوں" پیالی کی کو ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے بولے "میں نے

تین کو تیرہ بنا کر اتنا بڑا جرم تو نہیں کیا جتنا تمہاری قوم نے بیوپار کا بہانہ لے کر ہندوستان پر قبضہ ـــ"

" بکومت " تپا جی نے جج کی طرف سے کہا۔

اور پھر تپا جی نے اتنے زور کا قہقہہ لگایا اتنے زور کا قہقہہ لگایا کہ پڑوسیوں کے گھروں کی بجلیاں جل اٹھیں اور " کیا ہوا۔ کیا ہوا " گلی میں سے گزرنے والے لوگ پکار اٹھے اور ہمارے پڑوسی لالہ جگن ناتھ مجھے پکارنے لگے تھے اور تپا جی ان سب باتوں سے بے پرواہ ارشد کو بتلا رہے تھے کہ ڈرامے کا ڈائریکٹر پہلے یہاں میرے قہقہے سے زیادہ خوش نہیں تھا اور ریہرسل سے لوٹتے وقت تمہارا ابا مجھے بھرپور قہقہے لگانا سکھایا کرتا تھا۔ بخدا لوگ کوٹھیوں سے باہر نکل آتے تھے۔ رات کے سناٹے میں تمہارے باپ کا قہقہہ ـــ توبہ ارے توبہ"

" اب تو آپ بھی ماہر ہو گئے ہیں چچا جان ـــ سبھی اڑوسی پڑوسی تو اب بھی جاگ گئے ہیں اور اگر ایک بار پھر قہقہہ لگایا تو لوگ گھروں سے باہر بھی نکل آئیں گے "

شاید تپا جی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا وہ جذبات کی رَو میں بہہ گئے تھے وہ ارشد کو اپنے ہاتھ سے بسکٹ کھلانے لگے اور بولے " وہ الّو کا پٹھا ہے نا ـــ جیسے تو ابا کہتا ہے کمبخت نے اسی طرح تیری پیدائش پر مجھے نرگسی کوفتے کھلائے تھے ـــ سنا ہے اب تو اس نے بہت سارے روپے کما لئے ہیں پاکستان میں ـــ یہاں بہت انقلابی بنتا تھا کہا کرتا تھا " کرشن دیکھنا اگر پاکستان بن گیا تو وہاں تمہارے ملک سے پہلے انقلاب آئے گا ـــ خیر ـــ اس کی شاعری کا کیا حال ہے ؟ ـــ سنا ہے اب تو وہ غزلیں کہتا ہے ۔ ان دنوں تو بہت زور کی نظمیں لکھا کرتا تھا ـــ یاد ہے مجھے ایک ترقی پسند مصنفین کے مشاعرے میں بہت گالیاں دی تھیں۔ اس نے اللہ میاں سے لے کر سکھ دیوتا

وزیر اعلیٰ پنجاب تک کو۔ جرمنی کے ہٹلر سے ۱۹۴۲ء کے اندو لن کو۔ بڑے زور کی شاعری تھی اس کی۔ کمبخت جیل جانے اور جیل سے بھاگنے میں بھی بہت ماہر تھا۔ پہلے پہل پاکستان سے آنے والے اس کے خطوں میں سے بارود کی بو آتی تھی پھر آہستہ آہستہ اس کے خطوں سے بھینی بھینی خس کی خوشبو آنے لگی۔ انقلابی نظموں کی جگہ پھر وہ رومانی نظمیں لکھنے لگا۔ پھر۔ پھر وہی روایتی غزل لیکن کبھی کبھار اس کے دل کی پکار غزل کے کسی شعر میں اس شدت سے چیخ اٹھتی جو کسی انقلابی کی کراہ معلوم ہوتی تھی:"

زمیں پہ بھوک سے کہرام مچ گیا لیکن
خدا خموش ہے بے درد آسماں کی طرح

ہم حیران تھے کہ پتاجی آج سوتے کا نام ہی نہ لے رہے تھے اور زبان رکنے میں نہ آتی تھی۔ پچھلے واقعات یوں دہرا رہے تھے جیسے کل ہی کی بات ہو ہم سب بُت بنے بیٹھے ان کی باتیں سُن رہے تھے۔ پتاجی جوالا مکھی کی طرح اُبلے پڑ رہے تھے جیسے آج برسوں کی گھٹن۔ برسوں کے بعد سوچ کی گرہ کھُل گئی ہو۔۔۔ رات گئے تک پتاجی اپنے لڑکپن کی دلچسپیوں سے ہمیں مالا مال کرتے رہے۔ رات گئے تک میں ارشد اور پدما کبھی ہنستے کبھی غمگین ہوتے رہے۔ ارشد پتاجی ہی کے کمرے میں سویا تھا اور مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں پتاجی کے بارے میں سوچنے لگا کہ ان میں اس قدر تبدیلی کیسے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ سات آٹھ بجے اپنے کمرے میں گھس جاتے اور رات کے ایک، دو بجے تک کچھ پڑھتے رہتے۔ اب رات کے دس گیارہ بجے تک گھر نہیں لوٹتے کہاں جاتے ہیں کیا کرتے ہیں یہ پوچھنے کی جرأت کون کرے۔ سُنا ہے ان کا مزاج بچپن ہی سے بہت گرم تھا لیکن ہماری ماں کے مرنے کے بعد تو ان میں اور بھی چڑچڑا پن آ گیا ہے۔

ان کا ایک آدھ دوست ہے جو ان کی زندہ دلی کی بہت کہانیاں سُنایا کرتا ہے۔

لیکن وہ قصے ہمیں تو دیو مالا کی کہانیاں معلوم ہوتی ہیں۔ وہی دوست کہا کرتا ہے کہ ان کے دماغ میں چڑچڑاپن ملک کے بٹوارے کے بعد آیا ہے ان کے بہت سے دوست پاکستان چلے گئے اور اس کے بعد انہوں نے کوئی دوست بنایا ہی نہیں۔ بٹوارے کے بعد ان کا شغل کتابیں پڑھنا۔ گھر والوں کو ڈانٹنا۔ حکومت کو کوسنا پاکستان میں گئے دوستوں کو بھرپور گالیاں لکھنا ان کے خط کا جواب نہ آنے پر آسمان کی طرف دیکھ کر زمین پر تھوکنے کے سوا کوئی کام نہیں رہ گیا۔

اچھے کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ شہر میں معقول جائیداد سے معقول کرائے آتے ہیں۔ میری شادی جلد اس لئے کر دی کہ گھر بسا رہے۔ دوسرے میری ماں کے مرنے کے بعد ان کو کھانے کی لذت نے بھی بے بس کر دیا اور یہ بھی ایک وجہ تھی میری جلدی شادی کی۔ ویسے شاید ان کے تحت الشعور میں یہ بات بھی تھی کہ اگر میرے پاؤں میں زنجیر نہ ڈالی گئی تو میں ان کی جھڑکیوں کی تاب نہ لا کر کہیں گھر سے بھاگ ہی نہ جاؤں۔ پلاسٹک کی فیکٹری لگا کر میرے سپرد کر کے اب وہ بالکل ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ بھگوان کے نام سے منہ پھلا لیتے ہیں۔ ماتا کے جاگرن کرنے والوں کو گھر میں وہ گالیاں سناتے ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ سارے رات کی نیند حرام کر دیتے ہیں۔ ان ماتا کے بھگتوں کو ماں کا شیر ہی کھا کیوں نہیں جاتا۔ ادھر جگراتا کرنے والوں کی آوازیں تیز ہو جاتیں ادھر یہ کروٹیں بدل بدل گالیاں دیتے رہتے ہیں میری بیوی نہ جانے جگراتے کے شور و غل سے یا ان کی گالیوں کی وجہ سے کانوں میں روئی ٹھونس لیتی ہے

وہ کوئی ست سنگ نہیں سنتے۔ ملاؤں پیروں سے سخت نفرت ہے سادھوؤں سے حد درجہ چڑ ہے۔ غرضیکہ عجیب لاابالی طبیعت کے آدمی ہیں اور دل اتنا نرم کہ کسی کرایہ دار نے یا فیکٹری کے مزدور نے جھوٹوں اپنا دکھڑا رویا نہیں اور ان کی آنکھیں آبدیدہ ہوئیں نہیں۔ جو کچھ جیب میں ہو نکال کر مانگنے والے کے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں۔ ہر

سست روچیزان کے خون کے دورے کو تیز کر دیتی ہے۔ ویسے اب غصّہ آگے سے کم کرتے ہیں۔ آواز مدھم پڑ گئی ہے۔ میں نے کئی بار ڈاکٹر کا مشورہ لینے کی بات چلائی تو ہنس کر ٹال دیا۔ سگریٹ البتہ زیادہ پینے لگے ہیں سچ تو یہ ہے کہ کچھ دنوں سے بزرگ لگنے لگے ہیں لیکن آج جیسے وہ پھر سے جوان ہو گئے ہوں۔ میں رات بھر سو نہ سکا باقی سب گھر والے بہت دن چڑھے تک سوتے رہے جب پتاجی نے مجھ کو آواز دی وہ بہت ہشاش بشاش نظر آرہے تھے انہوں نے ارشد کو جگایا اور بولے "بیٹا جلدی سے داڑھی بنالو پھر بازار سے تمہارے لئے کپڑے لائیں اور کپتان سے تمہیں آدمی بنا دیں"

پتاجی اور ارشد بازار چلے گئے۔ پدما کھانا بنانے میں لگ گئی۔ میں فیکٹری چلا گیا۔ دوپہر کو کھانے کے لئے گھر آیا تو ارشد کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کل کا میلا کچیلا آدمی اب پریوں کے دیس کا شہزادہ نظر آرہا تھا۔ گدلی گدلی آنکھوں میں اب بہاریں جھوم رہی تھیں۔ آواز میں بھروسہ تھا۔ لہجے میں گرج تھی۔ بات کرنے میں اعتماد تھا۔ بات چیت وضعدار تھی اور جب میری بیوی کو بھابی جان کہہ کر پکارتا تو ایسا محسوس ہوتا کہ ایک تہذیب ایک باہمی سلوک اور پیار جو بہت دیر تک کھویا کھویا رہا تھا پھر مل گیا تھا۔ چچا جان کہتا تو محسوس ہوتا کہ شفقت پدری نے باہیں پھیلا کر ساری فضا سمولینے کی ٹھان لی ہو۔ مجھے بھائی جان کہتا تو یوں لگتا جیسے میرے دو نہیں چار بازو ہوں۔

پتاجی کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے ارشد پتاجی کے منہ میں گوشت کا ٹکڑا ڈالتے ہوئے کہتا "چچا جان برا نہ مانیئے یہ ہندو قوم گوشت کھانے تو لگی ہے لیکن اچھی بری بوٹی کی پہچان ان کو کہاں"

"تو بالکل اپنے باپ کی طرح بولتا ہے۔ وہ بھی ایسی ہی باتیں کیا کرتا تھا۔ ہاں بھئی اس کو بھی بھرتی کروا دیا تھا فوج میں اور پھر دونوں فوجی قیدی بن کر بھاگ

آتے میرے ہاں تو بڑا مزا رہتا۔ ہے نا؟

صبح سے شام تک اب پتاجی تھے اور ارشد تھا۔ شہر کے ہوٹل تھے یا سنیما گھر تھے۔ پڑوسی حیران ہو کر پوچھتے تھے اور ہم سب ارشد کو اپنا دور کا رشتہ دار کہہ کر چپ کرا دیتے۔ بات ادھر ادھر ہو جاتی۔ ہم پتاجی کی اس تبدیلی پر حیران تھے۔ وہ سنیما سے لوٹ کر آتے تو رات گئے تک فلموں پر چرچے ہوتے۔ پرانی اور نئی فلموں کے موازنے ہوتے۔ آج کل کی موسیقی پر لعنت بھیجی جاتی۔ پرانے سنگیت پر پھول چڑھائے جاتے۔ آج کل کی فلموں کے چھچھورے پن کو اپنے زمانے کی فلموں کی سادگی سے پرکھتے اور ارشد ہندوستانی فلموں کے مقابلے میں پاکستانی فلموں کے گھٹیا پن کا ذکر کرتا اور کہتا۔ ابا نے شاید پہلے پہل کوئی پاکستانی فلم دیکھی ہو تو دیکھی ہو اس کے بعد پھر وہ کبھی فلم دیکھنے نہیں گئے۔ ہاں کبھی کبھار چوری چھپے پرانی ہندوستانی فلم کسی سنیما میں دکھائی جائے اور انہیں پتہ چل جائے تو ضرور پہنچ جاتے ہیں۔

ارشد کے ساتھ پتاجی کو ایک دن میں دو یا تین شو بھی دیکھنے میں کوئی عذر نہ تھا اور ارشد فلمیں دیکھنے سے تھکتا ہی نہیں تھا۔ گھر میں ارشد پتاجی کی لائبریری کی کتابوں میں کسی کیڑے کی طرح گھسا رہتا۔ وہ کافی پڑھا لکھا تھا یہ اس کی باتوں سے بھی پتہ چلتا تھا۔ میری بیوی سے اس کی بحث اکثر پرانی اور نئی تہذیب پر چل نکلتی اور وہ اپنی بحث کو پوری اٹھان تک لے جا کر اس طرح ہار مان لیتا کہ پدما بھونچکی سی رہ جاتی اور پتاجی کھلکھلا کر ہنس دیتے اور کہتے یہ آرٹ بھی اس نے اپنے باپ سے سیکھا ہے۔ اور اسی کمبخت نے اسے سکھایا ہوگا۔ وہ ہم سب دوستوں سے ایسا ہی کیا کرتا تھا۔ ہم کسی غلط بات پر اڑے نہیں کہ اس نے ہتھیار پھینکے نہیں اور اس ہار میں خورشید کی کتنی بڑی جیت ہوتی تھی۔ ہم مہینوں اس پر سٹپٹایا کرتے

تھے لیکن وہ چنچل گھوڑے کی طرح پیٹھ پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتا تھا۔

پرانے مندروں کی کتاب لئے وہ پتاجی سے کچھ سمجھ رہا تھا۔ پتاجی اسے بتلا رہے تھے کہ کہاں کہاں وہ اس کا آیا۔ مندروں کو دیکھتے۔ مورتیوں کی تراش خراش کی داد دیتے۔ پرانے کلاکاروں کے فن کو سراہتے گھوما پھرا کرتے تھے۔ وہ مسلمان ہونے کے باوجود بیہروں الورا اور اجنتا کے بتوں اور تصویروں کے سامنے بیٹھا کہیں گم ہو جایا کرتا تھا۔ وہ سنسان مندروں میں رات رات بھر جاگتا گھومتا پھرا کرتا تھا۔ مندر کی گھنٹیوں کی مدھر آواز پر پہروں سر دھنتا۔ مسجد کی پرانی محرابوں میں بیٹھ کر وہ ساری ساری رات اللہ اللہ کیا کرتا تھا۔ اور پھر وہ اچانک ایک انقلابی ہو گیا۔ شاید ۱۹۴۳ء کے بنگال کے قحط نے اس پر بہت اثر کیا تھا۔ ان دنوں کی اس کی شاعری جیسے انسانیت کی چیخ ہو۔ جیسے الورا کے بت ماتم کر رہے ہوں جیسے مندر کی مورتیاں سر پیٹ رہی ہوں۔ جیسے مسجد میں مؤذن کی اذان نہ ہو بلکہ کسی بھوکے پیاسے کی کراہ ہو۔ پھر انقلاب آ گیا۔ وہ انقلاب نہیں جس کی خورشید کو تلاش تھی۔ جس کے خواب ہم سب دوست دیکھا کرتے تھے۔ اور یہ نام کا انقلاب ادھر بھی اور ادھر بھی ایک سیاسی لوٹ ہو کر رہ گیا تھا۔

ارشد نے کہا "چچا جان"۔۔۔

"میں ضرور چلتا تمہارے ساتھ" انہوں نے بات بیچ میں کاٹ کر کہا۔۔۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم پاکستانی فوج میں ہو۔۔۔ تمہیں ویزا ملنا بہت دشوار ہے۔۔۔ موقع ہے۔۔۔ سنیل کو ساتھ لے کر گھوم پھر آؤ۔۔۔ میں فیکٹری کی دیکھ بھال کر لوں گا۔۔۔ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی آئی ہے۔۔۔ اب بھی دہرائی جائے گی۔۔۔ کل میں اور تمہارے ابا گئے تھے ہندوستان گھومنے

پھرنے - اب تم اور سینیل جاؤ - جاؤ بیٹا - پھر یہ موقع نہیں ملے گا -"

ایک مہینے تک ہم کھجراہو - الورا - اجنتا - اور جنوبی ہندوستان کے مندروں میں گھومتے پھرتے رہے - وہ بہت پڑھا لکھا تھا اس کی تاریخ سے دلچسپی - ادب - آرٹ اور دوسرے فنونِ لطیفہ پر اس کی رائے میں ایک دلیل تھی اس کا تبصرہ ایک شگفتہ مذاق کا آئینہ دار تھا - ایک روز جنگ کی ہولناکیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ بنگلہ دیش کی بات چھیڑ بیٹھا - اس نازک مسئلے پر تو پتاجی نے بھی اس سے بات نہیں کی تھی - اور ارشد نے کنارک کے مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اس دردناک پیرائے میں اس کا ذکر کیا کہ ڈوبتے سورج کی کرنوں میں وہ امن کا دیوتا نظر آرہا تھا - وہ کبیر کا چشتی کا .... مہاتما بدھ کا روپ تھا دراصل وہ ایک انسان ہی کا اصل روپ تھا - اس نے عورتوں کی بے عزتی بچوں کے خون اور انسانیت کے لہو اور فوجوں کے مظالم، جنگ کی تباہ کاریوں کا اس طرح بیان کیا کہ ساری فضا بوجھل ہو گئی تھی - وہ ہمارے سفر کی آخری شام تھی - رات کو جب ہم گاڑی میں سوار ہوئے - وہ بہت بے چین تھا - وہ بہت گھبرایا گھبرایا تھا - وہ سارے سفر میں کچھ نہیں بولا - گھر پہنچتے پہنچتے اس کی آنکھوں کے گرد کالے کالے نشان ابھر آئے تھے - داڑھی بڑھ گئی تھی - اس کی آنکھوں کی چمک غائب ہو گئی تھی - ان میں گدلا گدلا سا پانی امڈ آیا تھا - بالوں میں گرد اٹ گئی تھی - جسم جل رہا تھا - جب ہم گھر پہنچے تو پتاجی گھر پہ نہیں تھے - پدما ٹالسٹائی کی ناول پڑھ رہی تھی پدما ہمارے سواگت کو اٹھی لیکن ارشد کو دیکھ کر پریشان ہو گئی "انہیں کیا ہو گیا ہے" پدما نے کہا -

میں نے ارشد کے بدن کو ہاتھ لگایا وہ گرم تھا - بہت گرم - وہ چپکے سے جا کر پتاجی کے کمرے میں پلنگ پر لیٹ گیا - پدما چائے بنانے چلی گئی اور میں اس کے سرہانے

بیٹھ کر اس کا سَر دبانے لگا۔ بخار تیز تھا اور میں ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا جب میں ڈاکٹر کو لے کر گھر پہنچا تو پدما پریشان باہر کے دروازے کی چوکھٹ سے سَر لگائے کھڑی تھی۔ میں نے سوچا شاید ارشد کی طبیعت زیادہ خراب ہو گی اور جب ہم اندر گھسنے لگے اُس نے کہا" وہ چلے گئے ہیں" "کہاں۔ کہاں" میری آواز خالی کمرے میں گونجنے لگی۔ اتنے میں پتاجی آگئے۔ اور میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔"ارشد چلا گیا"

" مجھے معلوم تھا۔ اگر اِس کی جگہ اس کا باپ ہوتا تو وہ بھی ایسا ہی کرتا" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا" وہ پولیس اسٹیشن جائے گا اپنے آپ کو پولیس کے سپرد کر دے گا"۔ دوسرے دن ہی پولیس والے اُسے ہتھکڑی پہنائے ہمارے گھر لے آئے تھے۔ ارشد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ بخار اسے اب بھی تھا لیکن آواز میں وہی گرج وہی بھرو سہ اور اعتماد تھا۔" چچا جانی۔ میں آگیا ہوں۔ میں پھر بھی آؤں گا۔ اب کے قیدی بن کر نہیں۔ فوجی وردی میں نہیں۔ انسان کے روپ میں دوستی کا سندیش لے کر۔ ابّا کا ایلچی بن کر۔ نیا سفارت خانہ کھولنے کو جہاں ویزا نہیں لینا پڑتا۔"

پتاجی پر اب بھی ارشد کو پناہ دینے کے جُرم میں مقدمہ چل رہا ہے۔ ضمانت پر رہا ہونے سے انہوں نے انکار کر دیا ہے۔ ارشد کی ڈائری۔ خورشید کے پرانے خطوط عدالت کی میز پہ بکھرے پڑے ہیں۔ پتاجی ملزموں کے کٹہرے میں سَر اٹھائے مسکراتے ہوئے ہر پیشی پر پہلے سے زیادہ خوش پہلے سے زیادہ جوان نظر آتے ہیں اور دُور بہت دُور ارشد کے ابّا ایک غزل لکھ رہے ہیں

آخر کو تو ڈھ جائے گی ہر ملک کی سَرحد
یہ کام بہت جلد نپٹ جائے تو اچھا

چراغوں کا دُھواں

خان صاحب برکت علی کو دیکھ کر اچھے دنوں کی یاد آجاتی ہے۔ بولتے تو ایسا لگتا جیسے کسی نے چاندی کے گلاس میں مصری گھول دی ہو۔ ان کا رنگ جیسے صندل میں گلال کی آمیزش۔ براق سفید داڑھی۔ لمبا قد اس پر لکھنوی ڈھنگ کی سفید پوشاک جیسے ابھی کوئی فرشتہ جنت سے زمین پر اتر آیا ہو۔ ہاتھ میں تسبیح ماتھے پر سجدوں کا نشان اور آنکھیں بے پیئے نشے میں چور۔ شام کو اپنی کوٹھی کے چبوترے پر بیٹھ کر اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ جہاں خس کا شربت نوش فرماتے وہاں قہقہے بھی بکھیرتے رہتے۔ وہ قہقہے لگاتے توضعداری کے ساتھ جیسے کہیں چاندی کی گھنٹیاں قدرے زور سے بج اٹھی ہوں۔ ان کے سبھی دوست کہتے تھے کہ زندگی میں خان صاحب سے شاید ہی کسی کی دل شکنی ہوئی ہو۔ ان کے در سے کسی طبقے کسی فرقے یا کسی سنستھا کا کوئی بھی سوالی مایوس نہیں لوٹا تھا۔ وہ اپنی بساط سے کچھ زیادہ ہی کر دیتے تھے۔ اسی وجہ سے بیوپار میں کئی بار ہاتھ تنگ بھی پڑ جاتا تھا لیکن ان کے ماتھے پر کبھی شکن نہیں آئی تھی۔

وہ دو باتوں کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے۔ ایک اپنی بیگم کا جو دس برس پہلے لڑکی کو جنم دینے کے بعد وفات پا گئیں تھیں اور بچی بھی جانبر نہ ہو سکی تھی۔ بیگم کا ذکر وہ اکثر شکایت بھرے لہجے میں کیا کرتے تھے لیکن اس شکایت میں کوئی ایسا لفظ

استعمال میں نہ لاتے جس سے بیگم کی توہین کا پہلو نکلتا ہو۔ ہاں بیگم کی تند مزاجی بچوں سے زیادہ لاڈ چاؤ کرنے کا ذکر وہ ضرور کر جاتے تھے۔ دوسرا انہیں اپنے خان صاحب ہونے کا قلق تھا۔ وہ انگریزوں کا یہ خطاب بالکل نہیں لینا چاہتے تھے گو وہ جنگ کے دوران بڑے ٹھیکیدار بن گئے تھے لیکن وہ چوری چھپے ان نوجوانوں کی مدد بھی کرتے رہتے تھے جو گلی کوچوں میں انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے پھرتے تھے۔ ان کو ان نعروں سے کیوں پیار تھا شاید وہ خود بھی نہیں بتا سکتے تھے لیکن ہر ایسا نعرہ ان کی توجہ کام سے ہٹا کر اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ وہ ہر نعرہ لگانے والے کو چاہے وہ کمیونسٹ ہو، سوشلسٹ ہو یا کانگریسی ہو انقلابی ہی سمجھتے تھے لیکن نہ جانے سیٹھ چونی لال کو کیا سوجھی اس نے گورنر سے مل کر انہیں خانصاحب بنوا ہی دیا۔ جب ان تک یہ خبر پہنچی کہ سرکار انہیں خان صاحب کا خطاب دینا چاہتی ہے تو وہ تذبذب میں پڑ گئے تھے۔ انکار کرنے پر انگریز افسروں کی ناراضگی کے ساتھ ساتھ لاکھوں کا کاروبار ہاتھ سے جانے کا خطرہ تھا۔ اس لئے وہ شہر بھر کے "[illegible]ں کی چہ میگوئیوں اور الزام تراشیوں کے باوجود خانصاحب بن گئے۔ خان صاحب کے ہاں ڈیڑھ یا دو سال کے فرق سے چار لڑکے پیدا ہوئے۔ چاروں خوبصورت، ذہین اور صحت مند تھے۔ محلے بھر میں خان صاحب کا گھر "خانہ چہار چراغ" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ نام سنتے ہی بیگم برکت علی کے ہونٹوں پر جہاں مسکراہٹ پھیل جاتی وہاں ماتھے پر شکن بھی پڑ جاتی تھی وہ چپکے چپکے ہی کوئی آیت پڑھنا شروع کر دیتیں۔ بیگم محلے بھر میں تند مزاج تو مشہور تھیں ہی اوپر سے چار چراغوں نے انہیں اور متکبر بنا دیا تھا۔ شام کو سفید کرتے اور پاجامے پہنے جب وہ چاروں گھر سے سیر کے لئے نکلتے تو بیگم نوکروں کو ہدایت دیتیں کہ چاروں گھر سے اکٹھے باہر نہ نکلیں۔ اور پھر جب بیگم امید سے ہوئیں تو خدا سے بس یہی دعا مانگتیں کہ اے ربِ کریم اب کے اسے بچی عنایت فرمانا۔ خدا نے ان کی دعا

سن بھی لی تھی اور مان بھی لی تھی لیکن زچگی کے دوران ہی بیگم برکت علی چل بسی تھیں اور کچھ دنوں بعد ہی ننھی بچی بھی۔ لڑکے ابھی چھوٹے تھے ناچار ان کی دیکھ بھال کے لئے خان صاحب کو اپنی بیوہ بہن کو بلوانا پڑا۔ ان کی ایک بچی بھی ان کے ساتھ آئی۔

بچے بھی بڑے ہونے لگے اور برکت علی بوڑھے۔ بیگم کی موت کے بعد وہ اور زیادہ حلیم ہو گئے تھے۔ بچوں سے بھی زیادہ پیار کرنے لگے تھے۔ یادِ خدا میں محویت بڑھ گئی تھی۔ خدا نے سوجھ بوجھ بھی خوب دی تھی۔ پاکستان بننے کے کچھ دن بعد ہی انہوں نے ٹھیکیداری چھوڑ کر چمڑے کا کاروبار شروع کر دیا تھا اور اب کاروبار پورے جوبن پر تھا۔ ان کا بہت سا وقت تو کاروبار کی دیکھ بھال میں گزرتا اور باقی عبادت یا برادری کے جھگڑے نپٹانے میں۔ کلکتہ جیسے بڑے شہر میں ان کی ساری برادری میں ان کا فیصلہ اٹل ہوتا۔ تنازع باپ بیٹے کا ہو یا ساس بہو کا خان صاحب کی بات سے انکار کرنے کی جرأت کسی کو نہ ہوتی تھی۔ ان کے فیصلے کو ہر موقع پر سراہا جاتا اس لئے ہر جگہ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے۔ وقت گزرتا گیا بچے جوان ہو گئے۔ ایک ابا کے ساتھ کاروبار میں لگ گیا۔ ایک ڈاکٹر بن گیا۔ ایک انجنیئر اور سب سے چھوٹے صاحب زادے پروفیسر۔ ان کو دیکھتے خان صاحب کا جی نہیں بھرتا تھا۔ چاروں باپ پر گئے تھے۔ صحت مند، خوب صورت اور لائق۔ خان صاحب جب ان کو دیکھتے بیگم کو یاد کرنے لگتے اور باوجود ضبط کے ان کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔

خان صاحب آزدہ رنج ضرور تھے لیکن وہ اس کا اظہار کبھی نہیں کرتے تھے۔

بس چپ ہو کر رہ جاتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ فیصلہ لینے میں دیر نہ کرتے اور پھر اس پر اٹل رہتے۔ ایک بار کاروبار کے سلسلے میں ان کے بڑے لڑکے ہدایت علی نے ایک سرکاری افسر سے بات چیت کے دوران نہ جانے کیسے کہہ دیا۔ "ابا جان وقت بدل گیا ہے آپ آج کل کے کاروبار کے بارے میں کیا جانیں"

توخان صاحب مسکرا کر چپ ہو گئے تھے ۔ اس کے بعد ہدایت علی اور سرکاری افسر کے درمیان جتنی دیر بات چیت ہوتی رہی انہوں نے توجہ ہی نہ دی اور وہ وہاں سے اٹھے بھی نہیں ۔ خدا جانے کہاں لو لگائے بیٹھے رہے ۔ ان سے ہدایت علی جب مخاطب ہوتے تو وہ ہاں یا نہیں میں سر بھی ہلا دیتے ۔ وہ وہاں بیٹھے ہوئے بھی وہاں نہیں تھے ۔ گھر لوٹ کر وہ ساری رات تلاوتِ قرآن کرتے رہے اور صبح طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے دوکان کی چابیاں نوکر کے ہاتھ ہدایت علی کو بھجوا دیں اور پھر اس کے بعد وہ دکان پر کبھی نہیں گئے ۔ ہدائیت علی شاید اس تبدیلی کو بھانپ گیا تھا لیکن وہ اپنی جگہ مطمئن تھا ۔ گھر پر بھی کسی نے بات نہیں کی کہ وہ دکان پر کیوں نہیں جاتے ۔ ایک بار ان کی ہمشیرہ نے پوچھا تو یہ کہہ کر ٹال گئے تھے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اب آرام اور اللہ کا نام لینے میں ہی نجات ہے ۔ ہدایت علی کو یوں تو کاروبار میں ابا کی کوئی خاص ضرورت محسوس ہی نہ ہوتی تھی البتہ جب چیکوں پر دستخط کروانے اور ضروری کاغذات صحیح کروانے آتا تو خان صاحب مسکرا کر اس کا خیر مقدم کرتے اور چپ چاپ مطلوبہ جگہ پر دستخط کر دیتے ۔ ہاں کبھی کبھی یہ ضرور کہتے "ہدایت ۔ اگر تم سب بھائی بیٹھ کر آپس میں فیصلہ کر لیتے تو مجھے اس سے بھی نجات مل جاتی ۔

" اچھا ابا جانی ۔ فرصت ملی تو یہ کام آپ کی دیکھ ریکھ میں ہو ہی جائے گا" ہدایت علی کہتے ۔

بڑے لڑکے ہدایت علی کی شادی اپنی پھوپی کی لڑکی سے ہو گئی تھی ۔ دوسرے بیٹے شفقت علی ڈاکٹر تھے اور ان کی بیوی بھی ڈاکٹر تھیں ۔ تیسرے بیٹے صباحت علی کی بیوی شہر کے بہت بڑے بیوپاری کی دختر تھیں اور چوتھے مشتاق علی ابھی شادی کے لئے تیار نہ تھے ۔

اتنا بڑا مکان اب چھوٹا پڑ رہا تھا سب کے کمرے الگ الگ ہونے کی وجہ سے

جگہ اور بھی تنگ ہو گئی تھی۔ ہدایت علی تو اکثر کہا کرتے تھے کہ مکان کے اوپر کی منزل تعمیر کروالی جائے لیکن کسی کو اتنی فرصت ہی نہ تھی اور خان صاحب جان بوجھ کر یہ کام اپنے ذمہ لینے کو تیار نہیں تھے۔ ہدایت علی کو کہہ دیتے "بھئی مجھے اللہ کا نام لینے دو مجھ سے یہ بکھیڑ نہیں ہونے کا اور اسی وجہ سے یہ تعمیر کی بات ٹلتی جا رہی تھی۔

خان صاحب سارا دن اپنے کمرے میں بیٹھے کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے تھے۔ صبح تلاوتِ قرآن۔ اس کے بعد اخبار یا کوئی مذہبی کتاب۔ اور پھر شام کو باہر چبوترے پر آرام کرسی ڈال کر بیٹھ جاتے کچھ دوست احباب بھی آ نکلتے۔ کچھ شعر و ادب کا چرچا ہوتا اور اس کے ساتھ ساتھ موسم کے مطابق شربت یا چائے کا دور چلتا اور نو ساڑھے نو بجے محفل برخاست ہو جاتی۔ یہی زندگی رہ گئی تھی خان صاحب کی۔

مکان میں دائیں ہاتھ باہر کا کمرہ خان صاحب کا تھا اور اس سے عقب والا صباحت میاں انجنیئر کا۔ مکان کے بائیں طرف کا باہر کا کمرہ مشتاق علی کے پاس تھا اور اس سے عقب والا ڈاکٹر شفقت علی کا۔ صحن کو پار کرنے کے بعد ایک کمرہ ہدایت علی کے پاس اور دوسرا خان صاحب کی بہن کے پاس تھا اور باہر ایک کونے میں رضیہ جو ان کی نوکرانی تھی اور دوسری طرف فقیرا خان صاحب کا بہت پرانا نوکر رہتا تھا۔ وہ تقریباً خان صاحب ہی کی عمر کا تھا۔ خان صاحب دونوں وقت کا کھانا کھانے گھر جایا کرتے تھے۔ ان کا گھر سے بس یہی ایک تعلق باقی رہ گیا تھا۔ گو بہو بیگمیں ان سے پردہ تو نہیں کرتی تھیں لیکن ان کی بہن ان کو سب سے پہلے کھانا کھلا دیا کرتی تھیں۔

ایک روز فقیرا بیمار ہو گیا۔ اور بہن کو اپنی لڑکی کے ساتھ نجی کام کے لئے اپنی زمینوں پر جانا پڑا تھا۔ شہر کے دو تین شرفاء شام کو خان صاحب سے ملنے آئے ہوئے تھے گپیں چل رہی تھیں۔ خان صاحب نے برآمدے میں جا کر رضیہ

کو پکارا۔ بھئی ذرا دُلہن سے کہئے کہ چائے اور کچھ کھانے کو بھجوا دیں ۔ فقیرا تو ہے نہیں تم ہی ذرا دروازے تک آجانا ۔ میں چیزیں خود لے جاؤں گا۔

خان صاحب یہ کہہ کر پھر دوستوں میں آبیٹھے ۔ پندرہ منٹ چائے کے انتظار میں گزر گئے لیکن چائے نہیں پہنچی ۔ اب خانصاحب کی بےچینی کچھ بڑھنے لگی ۔ دوستوں کی بات تو سنتے رہے لیکن دھیان اندر ہی لگا رہا ۔ اور پانچ منٹ بیت گئے ۔ چائے نہیں آئی ۔ خان صاحب پھر برآمدے میں گئے ۔ دوستوں میں ان کے جانے کے بعد پھر کچھ کھسر پھسر ہوئی ۔

" رضیہ بٹیا ۔ وہ میں نے چائے کے لئے کہا تھا ۔"

" میاں دلہن مائکے جانے کے لئے تیار ہو رہی ۔ میں بچے کو سنبھالے ہوں اور ڈاکٹر دلہن کسی مریض کو دیکھنے گئی ہیں ۔"

خان صاحب کا دل دھک سے رہ گیا ۔ چہرہ اتر گیا ۔ جیسے کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو ۔ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگے کہ خدایا زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں ۔ اب دوستوں کے سامنے کس منہہ سے جائیں ۔ لیکن برآمدے میں رُکا بھی تو نہیں جا سکتا تھا ۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں ۔ ناچار واپس آئے اور دوستوں سے کہا " حضرات معاف کیجئے ۔ ڈُلہن کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے " ان کے منہہ سے جھوٹ نکل ہی گیا حالانکہ وہ بیوپار میں بھی جھوٹ نہیں بولتے تھے ۔

" کوئی مضائقہ نہیں خان صاحب " سب نے کہا ۔

باتیں بعد میں بھی ہوتی رہی تھیں ۔ لیکن خان صاحب کو اب ان کی گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی ۔ وہ ہوں ہاں کرتے رہے ۔ لیکن دل پر جیسے کسی نے دہکتا ہوا کوئلہ رکھ دیا ہو ۔ اور دل ہی دل میں دوستوں کے چلے جانے کی

دعائیں مانگتے رہے۔ آخر خدا خدا کر کے جب دوست احباب رخصت ہوئے تو خان صاحب اٹھے منہ ہاتھ دھویا اور خدا کی عبادت میں بیٹھ گئے۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہ لیتے تھے۔ رخسار بھیگ گئے تھے داڑھی تر بتر ہو گئی تھی۔ اور آستین نم آلود۔

ایک دو بار رضیہ ان کے کمرے میں ان کو کھانے پر بلانے کے لئے آئی لیکن خان صاحب کو عبادت میں محو دیکھ کر لوٹ گئی۔ جب کافی دیر ہو گئی تو ہدایت خود آیا وہ معاملے کو نہ بھانپ سکا۔ رضیہ نے اسے شام کا واقعہ نہیں بتایا تھا۔ وہ کچھ دیر کمرے میں بیٹھا کسی کتاب کی ورق گردانی کرتا رہا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ابّا کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ وہ انتظار میں تھا کہ شاید ابّا جاگ رہے ہوں...... اس نے کتاب ہاتھ سے گرا دی تو ابّا نے آنکھیں کھولیں ان کی آنکھیں سوجی سوجی سی تھیں "ابّا جان کھانا کھا لیجئے۔"

"نہیں ہدایت آج کچھ کھانے کو دل نہیں چاہتا"

"تھوڑا سا خشکہ" ہدایت نے کہا۔

"نہیں بیٹا — آج فاقہ ہو جائے تو طبیعت سنبھل جائے گی"

ہدایت کے جانے کے بعد خان صاحب پھر قرآن پڑھنے بیٹھ گئے۔ تلاوت فرماتے رہے لیکن جی نہیں لگ رہا تھا۔ آج انہیں بیگم بہت یاد آئیں۔ وہ بے شک تیز مزاج تھیں لیکن کتنا خیال رکھتی تھیں ان کا (اور نہ جانے کیوں مرنے والی چھ سات دن کی بچی کیسے ان کے خیالوں میں جوان ہو کر کھڑی ہو گئی تھی اور — اور وہ ابّا جان کہہ کر چمٹ گئی تھی ان سے۔)

شاید رضیہ کو بیگم صباحت نے ڈانٹ دیا تھا — بات خان صاحب رضیہ اور بیگم صباحت تک ہی رہ گئی تھی۔ خان صاحب رات بھر خدا کی عبادت

میں لگے رہے۔ صبح سویرے آنکھ جھپکی تو جائے نماز پر ہی دراز ہو گئے۔ اور صبح جب رضیہ چائے لے کر آئی تو وہی مسکراہٹ ہونٹوں پر۔ وہی پیار بھری آواز اور رضیہ سے چائے کی پیالی لے کر ہمیشہ کی طرح پیار بھرا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ ہدایت خیر لینے آیا تو بڑی خندہ پیشانی سے اللہ کا شکر ہے کہہ کر چائے پینے لگے۔ آج اتوار تھا۔ سب گھر پر ہی تھے کہ تھوڑی دیر میں ہی صباحت تشریف لائے ــــ سلام علیکم ہوئی۔ ابا کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ " ابا جان ایک استدعا ہے آپ سے "

" کہو بیٹا "

" ابا جانی آپ ناراض نہ ہوئیے گا "

" ارے بیٹا ناراض اور تم سے۔ کہو بے جھجک کہو "

" بیگم کے بڑے بھائی ہانگ کانگ سے تشریف لائے ہیں۔ بہت سی ولایتی چیزیں لائے ہیں۔ مجھے ــــ نہیں نہیں بیگم کو ان کا stero set بہت پسند ہے اگر آپ اجازت دیں تو "

بھئی ہم کیا جانیں stero set کیا بلا ہے۔ پسند ہے تو لے لو۔ بھلا ہمیں اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آپ کی بیگم کو پسند ہے تو لے لو "

خان صاحب یہ stereo set والی بات واقعی سمجھ نہیں پائے تھے۔ یہ بلا ہندوستان میں نئی نئی وارد ہوئی تھی۔ بہت کم لوگوں نے اسے دیکھا تھا۔ اسی لئے ہاں کر بیٹھے۔ شاید سمجھے ہوں ہو گی کوئی عورتوں کے بناؤ سنگھار کی چیز۔

صباحت شکریہ ادا کر کے رخصت ہوا۔ ایک دو گھنٹے

بعد لدا ہوا ٹھیلا خان صاحب کے کمرے کے باہر رکا۔ خان صاحب دیکھنے کو کھڑکی تک پہنچے۔ سامان تو کیا دیکھتے وہ صباحت کی بات سننے لگے جو وہ ایک خوش پوش آدمی سے کر رہا تھا۔ ویسے خان صاحب کسی کی بات پر غور نہیں کرتے تھے۔ لیکن یہ سوچ کر کہ کچھ SEAREES کے بات چیت چل رہی تھی سننے لگے۔

صباحت کہہ رہا تھا " دیکھو ہمارے چیف انجینئر کو پتہ نہ چلے۔ میں تمہارے سب بل پاس کر دوں گا اور ــــ اور میرے کسی ساتھی کو بھی خبر نہ ہو ــــ ورنہ میں بلڈنگ کی تعمیر کو پاس نہیں کروں گا ــــ اور ہاں اس کا کیش میمو ضرور دے جانا۔ سیلز ٹیکس کا اندراج بہت ضروری ہے۔ کیش میمو منظور علی کے نام ــــ ہاں بھئی لکھ لو کہیں ــــ "

خان صاحب کا منہہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ وہ سوچنے لگے کہ ان کی اولاد کیا یہاں تک ذلیل ہو گئی ہے۔ یا اللہ۔ یا اللہ ــــ وہ سر پکڑ کر وہیں فرش پر بیٹھ گئے

صباحت سامان اتروا کر اپنے کمرے میں لے جا رہا تھا۔

خان صاحب نے بھی زندگی بھر کاروبار کیا تھا۔ ٹھیکہ داری بھی کی تھی لیکن کسی کو کبھی رشوت نہیں دی تھی۔ اپنا ٹھیکہ رد کروانا منظور کر لیتے لیکن اس بات پر کبھی رضا مند نہ ہوتے کہ افسروں کا حصّہ سیمنٹ میں سے نکالیں ــــ یہ بات وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے اور جب انہوں نے محسوس کیا کہ یہ دھندا ان کے مطابق نہیں چلنے کا تو ٹھیکیداری چھوڑ دی اور چمڑے کا کاروبار شروع کر دیا۔

یا اللہ اب یہ ایسی کمائی بھی گھر میں آئے گی۔ وہ پریشان ہو گئے اور جب وہ پریشان ہو جاتے تو یا دِ الٰہی ہی کا سہارا لیتے تھے۔ چپکے سے اٹھے۔ آنکھوں سے آنسو پونچھے اور بھرائی ہوئی آواز سے بسم اللہ کہا۔" ناگاہ اچانک زور کی گڑ گڑاہٹ ہوئی۔ گھر کا گھر گونج اٹھا۔ وہ چونکے۔ ادھر ادھر دیکھا۔ کان لگا کر سنا تو آواز عقب والے کمرے سے آ رہی تھی۔ وہ صباحت صباحت پکارتے برآمدے میں پہنچ گئے۔ اور صباحت ہنس کر" ہاں ابا حضور کیا بات ہے" کہتا ہوا برآمدے میں آگیا۔

"صباحت یہ گڑگڑاہٹ کیسی"

"ابا حضور یہ Stero ہے"

خان صاحب اپنا سا منہ لے کر اپنے کمرے میں لوٹ آئے۔

انہوں نے دیکھا کہ سارے گھر والے صباحت کے کمرے میں پہنچ گئے ہیں۔ اور پھر جیسے گھر میں زلزلہ آگیا تھا۔ کتوں بلّوں کے رونے کی مخلوط آوازیں۔ بھی کئی بار نماز کی نیت باندھی لیکن اُف یہ شور یہ غل۔ آخر ان کو اپنے کانوں میں روئی ٹھونسنی پڑی۔ تب کہیں جا کر نماز ادا ہوئی آج دوران نماز بھی وہ کچھ پریشان ہی رہے۔ نماز کے الفاظ اونچے اونچے بھی ادا کئے لیکن آج نماز میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔

رضیہ چائے لے کر آئی تو انہوں نے مشتاق کو بلا بھیجا۔ مشتاق نے سلام کیا اور ابا کے پاس بیٹھ گیا۔" ابا حضور آپ نے یاد فرمایا۔"

" مہینوں بیت جاتے ہیں تمہیں دیکھے بیٹا تم تو عید کے چاند

ہو گئے ہو۔ ابا سے ملنے کو جی نہیں چاہتا۔" خان صاحب نے بڑے پیار سے اور قدرے بھیگی بھیگی آنکھوں سے کہا۔

" ابا حضور۔ آپ نے یاد فرمایا اور میں حاضر ہو گیا"

" ٹھیک کہا بیٹا — ٹھیک ہی تو کہا — فرمانبرداری اسی کو کہتے ہیں — جب بلاؤ۔ حاضر ہو جاؤ "

" ابا حضور۔ آپ تو طنز کرتے ہیں۔ سارا دن تو کالج میں سر کھپانا پڑتا ہے۔ پھر ان دوستوں کا بھی منہ رکھنا پڑتا ہے جو کالج میں ساتھ پڑھاتے ہیں۔ اور رات کو صبح کے سبق کی تیاری — وقت ہی نہیں ملتا۔ کہئے ابا حضور کیسے یاد فرمایا۔ مجھے — مجھے بھائی صاحب کا set ٹھیک کرنا ہے۔ بہت آواز ہے اس کی"

" ہاں بیٹا میں نے اسی لئے بلوایا تھا تمہیں — یہ آواز بہت کرتا ہے۔ اور میری نماز تک ڈھب سے ادا نہیں ہو پاتی —"

" ابا حضور آپ ایسا کیجئے۔ مجھ سے کمرہ بدل لیجئے۔ میں آپ کے کمرے میں منتقل ہو جاتا ہوں اور آپ میرے کمرے میں تشریف لے جائیں۔ وہاں اس کی آواز نہیں آئے گی — اچھا تو ابا حضور میں فقیرا کو کہے دیتا ہوں وہ مالی کے ساتھ مل کر آپ کا سامان شفٹ کر دے گا — مشتاق فقیرا فقیرا پکارتا چلا گیا۔

خان صاحب کو محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کے کلیجے میں

ہاتھ ڈال دیا ہو۔ ساری عمر وہ اسی کمرے میں رہے تھے یہی کمرہ تھا جہاں جوانی سے لے کر آج تک انھوں نے اپنی دنیا بسا رکھی تھی۔ یہاں کی ہر چیز سے ان کی پرانی دوستی تھی۔ دیواریں ان کی جوانی کی راتوں کی ہمراز تھیں۔ فقیرا اور مالی جب میاں کی کتابیں اور الماری برآمدے میں نکال رہے تھے تو خان صاحب نے بڑی حسرت سے اپنے کمرے پر نظر ڈالی اور کمرے سے باہر نکلتے وقت ذرا دروازے سے ٹکرا گئے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کا بازو پکڑ لیا ہو اور دروازہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہو "میاں کیا سچ مچ ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہو بس اتنی ہی دوستی تھی۔"

خان صاحب برآمدے میں مونڈھے پر بیٹھے سامان بدلتا دیکھ رہے تھے۔ آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ مشتاق۔ مالی اور فقیرا سامان نکال رہے تھے۔ شام ہوتے ہوتے ادھر کا سامان اُدھر اور اُدھر کا سامان ادھر ہو چکا تھا۔ خان صاحب جب مشتاق کے کمرے میں داخل ہوئے تو دیوار پر نیم برہنہ لڑکیوں کی تصویریں دیکھ کر دل دھک سے رہ گیا۔ منہہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ فقیرا کو بلایا تو مشتاق ساتھ پہنچا اور بجائے ابا سے کچھ کہتا فقیرا پر برس پڑا۔ گالی گلوچ تک نوبت آ گئی۔ "میں نے تجھے پہلے کہا تھا کہ سب سے تصویریں اُتار دو۔ آخر وہی ہوا نہ — تو حرام خور ہو گیا ہے۔ ہماری تو بات ہی نہیں

سمجھتا۔ معاف کیجئے ابّا حضور آپ پانچ منٹ کے لئے برآمدے میں تشریف رکھیئے میں سب ٹھیک کرائے دیتا ہوں۔"

خان صاحب نم آلودہ آنکھیں لئے برآمدے میں آ بیٹھے۔

"ابے فقیرا کے بچے۔ تجھے کہا نہیں تھا کہ ابّا حضور کی نظر نہ پڑنے پائے ان پر — ذرا احتیاط سے اُتارنا — تو اور ابّا کیا جانیں۔ یہ دنیا کی خوب صورت عورتیں نہیں — یہ بڑی بڑی Pop Singers ہیں — لیکن تو کیا جانے Pop Singers کیا ہوتا ہے"

"چھوٹے حضور ہم ان پڑھ ٹھہرے اور آپ سولھویں جماعت پاس۔ ہم کیا جانیں یہ پاپ واپ"

"ارے سنبھل کے اگر تصویر پھٹ گئی — تو کھال کھینچ لوں گا تیری"

"تو حضور آپ خود ہی اُتار لیں — ہم اپنی کھال مفت میں کیوں کھنچوائیں"

"بک بک کئے جاتا ہے — کام کر کام" مشتاق نے فقیرا کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

خان صاحب سوچ رہے تھے کہ گھر کا کیا نقشہ بنتا جا رہا ہے۔ فقیرا جسے انہوں نے بچپن سے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ جوان کا ہم عمر تھا جسے انہوں نے اپنا بھائی سمجھا تھا جو گھر کا ایک رکن تھا۔ جس کو خان صاحب کی بیگم نے بھی بڑا بھائی سمجھا تھا۔ اور فقیرا جس نے اپنی ساری زندگی دو وقت کی روٹی اور کپڑے کی

ضرورت کے عوض اس گھر پر نچھاور کردی تھی۔ جس نے گھر کی عزّت میں چار چاند لگائے رکھے ۔ خان صاحب کو وہ وقت یاد آگیا جب ان کو کاروبار میں نقصان ہو گیا تھا اور فقیرا نے اپنے گاؤں میں اپنے حصّے کی زمین گروی کر کے خان صاحب کے سامنے روپیوں کی ڈھیری لگا دی تھی۔ اتنے بڑے نقصان میں حالانکہ سات سو روپے کی کوئی وقعت نہیں تھی پھر بھی — خان صاحب تِچ تِچ سبکیاں لے کر رونے لگے تھے۔

مشتاق چیخ چلا کر باہر گیا

تو فقیرا خان صاحب کے پاس آکر بولا " بڑے میاں حوصلہ رکھو ۔ آپ کو " انقلاب زندہ باد " کا نعرہ بہت پسند تھا نا۔ یہ وہی انقلاب تو ہے — زمانہ بدل گیا بڑے میاں — ہمیں بھی بدلنا چاہیئے — مجھے معلوم ہے حضور آپ میرے لئے پریشان ہو اٹھے ہیں — دیکھئے نا میں نے کس خندہ پیشانی سے سب کچھ دیکھا اور سُنا ہے ۔ اور کام بھی کر رہا ہوں۔ رات ہو چلی ہے ۔ میں آپ کے لئے کھانا لاتا ہوں — اب آپ نئے کمرے میں تشریف لے چلئے ۔ خطا دراصل میری تھی ۔ مجھے وہ ناپاک تصویریں پہلے ہی ہٹا دینا چاہیئے تھیں۔

خان صاحب نے پیار سے فقیرا کو سینے سے لگا لیا تھا ۔ اور دونوں بہت دیر تک روتے رہے اور یا اللہ یا اللہ کی آواز ان کے منہ سے نکلتی رہیں ۔ رات کو شفقت بیگم کے ساتھ

گھر لوٹا تو انہیں کمرے کی تبدیلی کا کچھ علم نہ تھا تو آتے ہی مشتاق مشتاق پکار کر دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ خان صاحب کھانا کھا کر لیٹے ہی تھے۔ اٹھے اور دروازہ کھولا۔

"اوہ ابا حضور آپ۔ معاف کیجئے ابا جان آپ کو ناحق تکلیف ہوئی۔ آپ اس کمرے میں کیسے"

"یونہی بیٹا۔ ادھر اس کمرے میں رہتے رہتے جی اوب سا گیا تھا۔ بہت دیر کر دی آج آنے میں"

"ابا حضور مریضوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اب بیچ میں چھوڑ کر آیا نہیں جاتا۔ بیگم کہہ رہی تھیں کہ وہ کلینک کھولنا چاہتی ہیں تو ابا جان بہت بگڑی مانگتے ہیں دو کانوں کی۔ میں مشتاق سے یہ کہنے آیا تھا کہ اس کے کمرے میں یعنی اب جو آپ کے پاس ہے اس میں کلینک کھول لیا جائے۔ مشتاق ہوسٹل میں منتقل ہونے کو تیار تھا۔ خیر ابا حضور آپ آرام فرمائیے"

"یہ تو بڑی مشکل ہوئی" بیگم شفقت نے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اپنے خاوند سے کہا۔ گو بیگم شفقت نے یہ الفاظ بہت دھیرے سے کہے تھے لیکن خان صاحب کے کانوں تک پہنچ ہی گئے۔

صبح جب فقیرا خان صاحب کے لئے چائے لے کر پہلے والے کمرے میں غلطی سے پہنچا اور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا تو مشتاق دہاڑتا ہوا باہر نکل آیا تھا "تو سونے بھی نہیں دیتا کمبخت بدتمیز"

اور فقیرا جو برسوں سے مالک کو اسی کمرے میں اٹھتے بیٹھتے دیکھتا آیا تھا - بہت گھبرا گیا - اسے کمرے کی تبدیلی کے بارے میں کچھ یاد نہیں رہا تھا جو اس نے اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔

مشتاق اتنے زور سے بولا کہ خان صاحب بھی کمرے سے باہر نکل آئے اور " کیا ہوا - کیا ہوا " کہتے ہوئے مشتاق کے پاس پہنچ گئے - مشتاق کے منہ سے بدبو کا بھبکا ان کی ناک تک پہنچا -

خان صاحب فقیرا کا ہاتھ تھام کر اپنے کمرے میں لے گئے۔ خان صاحب کو کچھ سوجھ نہیں رہا تھا - صرف بھیگی بھیگی آنکھوں سے وہ فقیرا کو دیکھتے رہے - اور بہت دیر بعد فقیرا سے کہا -

" فقیرا تیرے گاؤں میں تیرا اپنا گھر ہے نا ؟ "

" ہاں حضور ٹوٹا پھوٹا ایک گھر ہے "

" تو سامان باندھ لے - ہم وہیں رہیں گے - میں تو خانہ کعبہ میں جا رہتا لیکن اب وہاں کی حکومت کے اپنے قوانین ہیں - چلو فقیرا سامان باندھ ہی لو - " سامان بندھ گیا - رکشا کوٹھی کے باہر کھڑا تھا - فقیرا سامان رکشا میں رکھ رہا تھا - گھر کی بہو بیگمیں کھڑکی میں سے دیکھ رہی تھیں - ان کے میاں خراٹے بھر رہے تھے - خان صاحب نے ایک حسرت بھری نظر مکان پر ڈالی - آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ نکلے اور پھر وہ اللہ کا نام لے کر رکشا میں بیٹھ گئے - اور خان صاحب سوچتے رہے کہ ابھی شفقت - صیا حت - ہدا یت - مشتاق بھاگے بھاگے آئیں گے اور ابا جان

کہتے ہوئے ان سے لپٹ جائیں گے ۔ کہیں گے " ابّا حضور۔
ابّا حضور آپ یہ کیا کر رہے ہیں ــــ ہمیں کیوں چھوڑے جا رہے
ہیں ــــ ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے ــــ ابّا حضور نہیں جانے
دیں گے ہم آپ کو ــ"

رکشا کلکتے کی سڑکوں پر بھاگا جا رہا تھا اور خان صاحب
کی آنکھیں بند تھیں ۔ نہ جانے وہ اب بھی چار چراغوں کے بارے
میں سوچ رہے تھے ــــ یا اللہ سے لو لگائے بیٹھے تھے ــــ یہ
خان صاحب جانیں یا اللہ ۔